
منٹو کے
فحش افسانے

تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے عام قاری
تک پی ڈی ایف میں پہنچائی جاتی ہیں
کتاب کے مواد سے ہمارا متفق ہونا لازمی نہیں
۔ فیس بک گروپ (کتابیں پڑھیے)
ایڈمنز ! سید حسین احسن ۔

0314 595 1212

0344 818 3736



منٹو کے فحش افسانے

سعادت حسن منٹو

قیمت صرف ایک روپیہ

ناشران

اردو پاکٹ بک سیریز پوسٹ بکس نمبر ۱۲۹۳ دہلی

نیو تاج آفس پوسٹ بکس ۱۷۴۹ دہلی

محبوب المطابع برقی پریس دہلی

بُو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ساگوان کے اس سپرنگوں والے پلنگ پر جو ذرا کھڑکی کے پاس سے کچھ ادھر سرکا دیا گیا تھا۔ ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کیساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہا رہے تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی تھی۔ شام کے قریب دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تمام خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو غالباً ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور غالباً بارش سے بچنے کے لئے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی کھانس کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اُسے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین چھوکریاں جو پہلے سستے داموں میں مل جاتی تھیں عورتوں کی انگریزی فوج میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں سے بعض نے فورٹ کے علاقے میں ڈانسنگ اسکول کھول لئے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی۔

رندھیر بہت اُداس ہو گیا تھا۔ اس کی اُداسی کی وجہ یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ رندھیر جو فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا صرف اسلئے اس پر فورٹ کے اکثر تحبہ خانوں کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے کہ اسکی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج ہوٹل کے گرد و نواح کی کئی کرسچین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وہ ان کرسچین لونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہیزل سے اسکی تازہ پیدا شدہ رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اسکے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی۔ اور ہر روز صبح کو وردی پہنکر اور اپنے کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے پر جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پاتھ پر تمام جانے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرسچین چھوکریوں کی طرف اتنا راغب ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی قابل نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کئے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سناتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ اُسے وہ اپنے ساتھ سُلائے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اسکے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا، کہیں ایسا نہ ہو، بے چاری کو نمونیہ ہو جائے۔ تو رندھیر نے اس سے کہا تھا " یہ کپڑے اُتار دو سردی لگ جائے گی "۔

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی کیونکہ اُسکی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے مگر بعد میں جب رندھیر نے اُسے اپنی سفید دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا۔ جس کا مَیل بھیگنے کے باعث اور زیادہ اُبھر آیا تھا ۔ کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی پھر اس نے اپنی بھنسی بھنسی چولی اتارنے کی کوشش کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی ۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی جب تھک کر ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا " میں کیا کروں نہیں کھلتی "۔

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا دوسرے ہاتھ میں دوسرا۔ اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی۔ رندھیر کے ہاتھ زور میں اِدھر اُدھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ ایک لحظے کے لئے خیال کیا کہ

اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پہ نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو
چابکدستی سے کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔
اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی
طراوٹ، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ
کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔
مٹیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں ایک
عجیب قسم کی چمک محلول تھی۔ سیاہی، ئل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک
تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی۔ جو چمک ہونے کے
باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دیئے معلوم ہو رہے
تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔
برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح کپکپا رہے
تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے ایک
غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پہ پڑے تھے۔ اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی
تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا
کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ مگر گرم حمام میں نہاتے
وقت محسوس ہوا کرتی تھی۔
ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونوں گویا ایک دوسرے
میں مدغم ہو گئے تھے۔ انہوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیونکہ جو کچھ
کہنا سننا تھا۔ سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہو رہا تھا۔ رندھیر
کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے
چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور موٹے موٹے مسام جو اُن کے اردگرد کالے

دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اس ہوائی لمس سے جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ کہ رندھیر خود بھی ایک لمحے کے لئے کپکپا اٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الہڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سنانا چاہئیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں۔ اور اسے کوئی تکلیف نہ دیتی تھیں۔ مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا، بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بو آتی رہی تھی۔ اس بو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی۔ وہ تمام رات پیتا رہا۔ اسکی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے ہر جگہ سے۔ یہ جو بدبو بھی اور خوشبو بھی رندھیر کے ہر سانس میں موجود ہوتی تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی۔ اگر اس کے بدن سے یہ بو نہ اڑتی۔ یہ بو جو اس کے دل و دماغ کے ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی۔ اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بو نے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لئے آپس میں

حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے۔ جہاں پہنچکر وہ خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی۔ جو مائل بہ پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی۔ وہ دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلتی تھی۔ رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نہیں وہ بو کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی ـــــ عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبو دار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بو دب جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار ـــــ ـــــ ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما۔ اور اسے بالکل گھن نہ آئی۔ بلکہ عجب کی طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ اسکی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بو نکلتی تھی جو غایت درجہ قابلِ فہم ہونے کے باوجود ناقابل فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے۔ اسکا مطلب بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے۔ یہی، کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا

تھا تو پیپل کے پتے لرز لرز کر نہار رہے تھے۔ ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی بھی سموئی تھی جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہے ۔ برسات کے یہی دن تھے جب رندھیر کے کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا۔ مگر اب اس کے ساتھ ایک دوسرا بھی پڑا تھا۔ اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے۔ موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی بھی اتر رہی تھی۔ مگر فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ایک گوری چٹی لڑکی اپنے ستر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی۔ اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سرخ ازار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ اس پلنگ پر اس کے دوسرے اترے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی سنہری پھولوں والی قمیض، انگیا، جانگیہ اور دوپٹہ۔ سب کا رنگ سرخ تھا۔ بے حد سرخ، یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سرخی اور مقیش کے ان ذرات نے مل جل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ بے جان سا۔ اڑا اڑا اور اسکے

گورے سینے پر انگیہ کے کچے رنگ نے جا بجا لال لال دھبے ڈال دیئے تھے چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی تھوڑی نیلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے جس کے باعث وہاں سرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا۔ کیا ایسا نہیں لگتا جیسا میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے۔ کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح۔ کیونکہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتنوں پر ملتے جلتے سے خراشیں آ جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر کئی ایسے نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے اردگرد کس کر بندھے ہوئے ازار بند کا نشان۔ وزنی اور نوکیلے جڑاؤ نیکلس سے اس کے سینے پہ کئی جگہ خراشیں پیدا ہو گئی تھیں جیسے ناخنوں سے بڑے زور سے کھجایا گیا ہے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ پیپل کی نرم نرم کومل پتیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ایسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی کہ رندھیر تمام رات اس روز سنتا رہا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس کے گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کئے

تھے۔ اسکے نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا تھا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھیڑے ہوئے تاروں کی آواز سنی لیکن وہ پکار کہاں تھی۔ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سونگھی تھی ــــ وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے کہیں زیادہ قابل فہم تھی۔ وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے۔ مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دور۔ بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں ان مٹیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی۔ ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی تھی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھی سے گندھے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی۔ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی جو اب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالتِ نزع کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس سی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس۔ جس طرح بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے ــ اُداس۔ بے رنگ، بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں بے رنگ پانی میں ساکت ہوتی ہیں، اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اسکے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی۔ سفید

سفید دھبوں کی صورت میں۔ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں بو بسی ہوئی تھی جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دور رس تھی۔ جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا۔ جو خود بخود ناک کے راستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیا جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی... اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی جس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی اور اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی۔ رندھیر کی نبض کو تیز نہ کر سکی وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جبکہ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

دُھواںؔ

وہ جب اسکول روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی کو دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس میں دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے گالوں پر گرمی کی لہر سی دوڑ جاتی تھی، پھڑک رہا تھا۔ جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی۔ لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ویسی ہی کیفیت کا حامل تھا، جو ربڑ کے جوتے پہنکر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آوازیں مدھم تھیں جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ چپکے چپکے۔ دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں۔ ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ اونچی آواز پیدا نہ ہو

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جارہا تھا۔ آج اس کی چال بہت سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کئے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اُسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔ فضا میں اجلاپن نہیں تھا روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی۔ جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اسلئے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اُسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے اور کچھ آ رہے تھے۔ کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اسکا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ اس لئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا۔ اور قبرستان میں

چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا
یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شرارت اس کے کیچڑ سے
لت پت کپڑے، سُرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے
تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی۔ اور پھر آکر ہاتھ پاؤں
دھوتے، کپڑے بدلنے کا مرحلہ۔ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب
اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سُنی تو اسے یہ سب بیتی ہوئی باتیں یاد
آگئیں اور اس نے سوچا جب سکتر صاحب کا جنازہ اُٹھے گا تو بارش شروع
ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے
اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبلا اُٹھیں گے۔

یہ خبر سنکر مسعود نے سیدھا اپنی کلاس کا رُخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر
اس نے اپنے ڈسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے
روز پھر لانا تھیں اُسمیں رکھیں اور باقی بستہ اُٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان
میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود
دُکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو
جس میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا چھو کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر
انگلی سے بکرے کے اُس حصہ کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت
گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی
دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر
گوشت چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی

تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی۔ اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لیئے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے جس پر اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی موت کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ اسلیئے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے ابا جی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لیئے اس کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی۔ اسکی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچیخانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری سرگم سنتا رہا جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا۔ امی جان، آج میں نے قصائی کی دوکان پر دو بکرے دیکھے

کھال اتری ہوئی تھی۔ اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔

"اچھا.....!" یہ کہہ کراس کی ماں چولہے میں لکڑیوں سے کوئلے جھاڑنے لگی۔

"ہاں اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔"

"اچھا!" یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا۔ جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

"اور یہ گوشت کئی جگہ پھڑک بھی رہا تھا۔"

"اچھا.....!" مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا بھی چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کیسے پھڑک رہا تھا؟"

"یوں.....یوں۔" مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

"پھر کیا ہوا؟"

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کیلئے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ "پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی۔ کہ قصائی کی دوکان پر گوشت پھڑک رہا تھا میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔"

"گرم تھا..... اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے۔"

"بتائیے"

"آؤ میرے ساتھ آؤ۔"

"نہیں آپ پہلے بتائیے۔ کام کیا ہے"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ"

"جی نہیں پہلے آپ کام بتائیے"

"دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے .... میں پلنگ پر لیٹتی ہوں تم ذرا پاؤں دبا دینا ...... اچھے بھائی جو ہوتے۔ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے" یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پہ مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے، جب دیکھو درد ہو رہا ہے۔ اور پھر آپ دبوائی بھی مجھی سے ہیں۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں" مسعود اٹھ کھڑا ہوا اور راضی ہو گیا۔

"چلئے" لیکن آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔

"شاباش۔ شاباش" اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے" مسعود آج ضرور بارش ہوگی" یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ "دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔"

"بہت اچھا! لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آ کر جلدی سے میری کمر دباؤ۔ ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔"

کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی۔ اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ تو کلثوم نے مزہ لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کر دیا۔

کلثوم کے کولہوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے۔ جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لئے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ وہ ان کا مطلب سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی مکمل ہی نہ تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بد دلی سے کمر دبانا شروع کی تھی۔ مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھینچی بھینچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔ ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی: شاباش مسعود شاباش لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دباؤ بالکل اسی طرح

شاباش میرے بھائی"۔

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی۔ اور دوہری ہو گئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا۔ لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی تڑپ منجمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے۔ چنانچہ اس نے کہا۔ "آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جائیے میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی۔ اسکا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ "نا بھائی میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم وحشیوں کی طرح دباتے ہو۔"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ "نہیں اب کی دفعہ پورا بوجھ میں آپ پر نہیں ڈالوں گا ...... آپ اطمینان رکھئے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا۔ اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پہ پیر جمائے اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے پیر چلانے شروع کئے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے نیچے دب دب کر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار سکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازی گر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازی گر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

اس نے کئی بار اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں۔ مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا۔ کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟ لیکن ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا۔ اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو سفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

"بس بس" کلثوم تھک گئی۔ "بس بس"۔

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو جھٹک دے لیکن جب اس نے ارادہ کر کے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہو گیا۔ اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر فرش کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں سے مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھیلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور ناز بو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے فضا میں نیند سی گھلی ہوئی تھی۔ ایسی نیند جس میں بیداری زیادہ ہوتی ہے۔ اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں لپٹے جاتے ہیں۔ جیسے اونی کپڑے

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا۔ جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا۔ مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا۔ پھر بھی ایک گمنام مزا اس سوچ بچار میں اسے آرہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہوگئے۔ اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے۔ تو اس نے مٹھیاں کس لیں۔ اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی۔ مگر وہ نم آلود ہو گئے چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا۔ کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آگیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہوکر مسعود بیٹھک میں چلا گیا۔ اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم

نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔
مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے۔ جہاں اس کے جسم کو حیرت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی ہی گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی دکھن پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزہ سا آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ کہ کہاں کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا۔ البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہونیکا ارادہ بن گیا تھا۔ دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ کوئی باورچی خانے میں تھا۔ نہ صحن میں۔ ادھر ادھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رک گئی تھی مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی "کون ہے؟"

"جی میں ہوں مسعود"۔

اندر سے آواز آئی "کیا کر رہے ہو؟

"جی کھیل رہا ہوں"۔

"کھیلو..... پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا" تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے....... زیادہ شور نہ مچانا۔"

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑے رہنے دی۔ اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا۔ اور دوسرا نیم باز .... مسعود کو ایک شرارت سوجھی دبے پاؤں وہ نیم باز دروازے کی طرف بڑھا۔ اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں۔ خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کے دماغ پر دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا تھا جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر بھی ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا۔ اور زیادہ زور لگانے پر تو ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر رکھ کر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب تھک ہار گیا تو جھنجھلا گیا اس نے ہاکی پھینک دی۔

ننگی آوازیں :-

بھولو اور گاما دو بھائی تھے۔ بے حد مخلتی۔ بھولو قلعی گر تھا۔ صبح دھونکنی سر پر رکھ کر گھر سے نکلتا۔ اور دن بھر شہر کی گلیوں میں بھانڈے قلعی کرا لو " کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کریانہ ضرور ہوتا۔

گاما خوانچہ فروش تھا اس کو بھی دن بھر چھابڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا۔ تین چار روپے یہ بھی کما لیتا تھا مگر اس کو شراب کی لت تھی۔ شام کو دینے کے بھٹیار خانے سے کھانا کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیئے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چہکتا۔ دینے کے بھٹیار خانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے۔ اور اسی کے سہارے جیتا ہے۔

بھولو نے گاما کو جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا۔ بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب کی لت بہت بری ہے۔ شادی شدہ ہو۔ بیکار پیسہ برباد کرتے ہو یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو بھابی ٹھاٹ سے رہا کرے۔ ننگی بچی اچھی لگتی ہے تمہیں اپنی گھر والی۔ گاما نے اس

کان سنا۔ اس کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا۔ تو اس نے کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے۔ ایک بڑی بلڈنگ تھی جس میں سروینٹ کوارٹرز تھے ان پر جہاں اوروں نے قبضہ جما رکھا تھا وہاں دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر جو کہ دوسری منزل پر تھا ـــــ اپنی رہائش کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔

سردیاں آرام سے گزر گئی تھیں ـــــ گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی۔ بھولو تو اوپر کوٹھے پر کھاٹ بچھا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی۔ اوپر پردے کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا، ایک گاما ہی کو تکلیف نہیں تھی کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا۔ اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلن کو ایک بات سوجھی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے ارد گرد ٹاٹ تان دیا۔ اس طرح پردے کا انتظام ہو گیا۔ کلن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی۔ اور چند ہی دنوں میں بانس وغیرہ گاڑ کر ٹاٹ اور کمبل جوڑ کر پردے کا انتظام کر دیا۔ یوں ہوا تو رک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹرز کے دوزخ سے ہر حالت میں جگہ اچھی تھی۔

اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پالے گا۔ جب گاما کبھی اس کے بیاہ کی بات چھیڑتا۔ تو وہ کہتا۔ نا بھائی۔ میں اپنے "نردے پنڈے" پر جونکیں

نہیں لگوانا چاہتا۔" لیکن جب گرمیاں آئیں۔ اور اس نے ادپر کھاٹ بچھا کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ دن میں ہی اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام کو دینے کے بھٹیار خانے میں اس نے اپنے بھائی سے کہا۔" میری شادی کردو، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

گاما نے جب یہ سنا تو کہا" یہ کیا مذاق سوجھا ہے تمہیں"

بھولو بہت سنجیدہ ہو گیا" تمہیں نہیں معلوم ...... پندرہ راتیں ہو گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے۔"

گاما نے پوچھا" کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں یار ـــ دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے ـــ عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ نیند کیا آئے گی خاک"

گاما زور سے اپنی گھنی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرما گیا۔" وہ جو کالن ہے، اس نے تو حد ہی کر دی ہے ـــــــــ سالا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی ـــ بچے پڑے رو رہے ہیں مگر وہ ...."

گاما حسب معمول ہنستے ہنستے نڈھال ہو گیا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چہک چہک کر بتایا کہ اس کے بھائی کو آج کل نیند نہیں آتی۔ اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ــــــ کے بل پڑ گئے۔ جب یہ لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا کوئی اس سے پوچھتا" ہاں بھائی کالن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے"

Scanned by CamScanner

کوئی کہتا "میاں مفت میں مزے لیتے ہو —— ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو —— سو فیصدی گانی بولتی "۔

بڈھوں نے گندے گندے مذاق کئے۔ بھولو چڑ گیا۔ گاما صحیح حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا "تم نے تو یار میرا مذاق بنا دیا —— دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے جھوٹ نہیں ہے میں انسان ہوں —— خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج بیس دن ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے —— تم میری شادی کا بندوبست کر دو ورنہ قسم پنج تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا —— بھابی کے پاس میرا پانسو روپیہ جمع ہے —— جلدی کر دو بندوبست"۔

گاما نے مونچھ مروڑ کر پہلے کچھ سوچا پھر کہا "اچھا ہو جائے گا بندوبست تمہاری بھابی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے"۔

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات پکی ہو گئی۔ صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔ خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کاج جانتی تھی۔ ویسے صمد بھی شریف تھا۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو محنتی تھا۔ تندرست تھا۔ جون کے وسط میں شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ صمد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا۔ مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو نے اپنی دلہن کے لئے اوپر کو ٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ ٹاٹ خوب کس کر لگایا۔ چارپائیوں پر نئے

کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔ شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کئے۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کو دھکا سا لگا۔ وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا۔ مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کر دیا۔ پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو پسینے میں تر بتر ہو گیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں۔ جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں۔ اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔

کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا؟ کیا آس پاس کے لوگ یہ آوازیں سنیں گے۔ کیا وہ بھی اس کے مانند راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں گے۔ کسی نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہتی تھی کہ ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے۔ پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کی خاموشی میں ہلکی سی سرگوشی بھی دوسرے کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے ——— لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں ——— ایک کوٹھا ہے اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے۔ سینکڑوں آنکھیں سینکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے ہلکی سی آہٹ پوری تصویر بن کر سامنے آجاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

برٹاٹ کا پردہ کیا ہے۔سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے۔ وہ سامنے کان اپنی بیوی کی چھاتیاں دبا رہا ہے۔ وہ کونے میں اس کا بھائی گا ما لیٹا ہے تہمد کھل کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عبد و حلوائی کی کنواری بیٹی شاداں کا پیٹ چھدرے ٹاٹ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے،

شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ نہ کہیں بھاگ جائے مگر کہاں جاتا۔ اب تو جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صمد مزدور خودکشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزر تی۔ جو طوفان تھا وہ الگ۔

" اچھا جو ہوتا ہے۔ ہونے دو ۔ میرے ساتھی اور بھی تو ہیں آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی مجھے بھی "۔۔۔ بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور نئی نویلی دلہن کو ڈولی میں گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے بھولو اور گاما کو خوب مبارکبادیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے۔ انھوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لئے کئی کامیاب گر بتائے۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھابی نے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردوں کے نیچے بستر کا بندوبست کر دیا۔ گامے نے چار موتیے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیئے۔ ایک دوست اس کے لئے جلیبیوں والا دودھ لے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بے چاری شرم کی ماری سر نیوڑھائے ، گھونگھٹ کاڑھے سمٹی ہوئی

تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا پتلا کرتہ اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا پنکھا جھل رہا تھا۔ مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا۔ نیچے کوارٹر ہی میں رات کاٹے گا۔ مگر جب گرمی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دلہن سے چلنے کو کہا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے کوئی اس کو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دلہن سمیت داخل ہو جائیگا۔ اور صبح منہ اندھیرے نیچے اتر جائے گا۔

جب وہ کوٹھے پر پہنچا تو بالکل خاموشی تھی۔ دلہن نے شرماتے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نقرئی گھنگرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونک کر جاگ پڑی ہے چارپائی پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں ادھر ادھر ابھریں دبی دبی سرگوشیاں اس تپتی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائی اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا بیوی سے بات کی تو پاس ہی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ دور کونے میں جہاں کلن کی جگہ تھی۔ وہاں چارپائی پر چرچوں چرچوں ہونے لگی یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی ــــ عیدو حلوائی

کی کنواری لڑکی شاداں نے دو تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھڑے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکراتا تو ایک چھناکا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چارپائی سے بار بار مچھر جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولا اپنی دلہن سے کوئی بات نہ کرسکا۔ اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے اور ساری چارپائیاں چیں چیں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھڑی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی کچھ دیر جاگتی رہی ——— پھر سو گئی۔

بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے گا۔ مگر اس کو نیند نہ آئی۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں ——— آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھی۔

اس کے دل میں بڑے ولولے تھے۔ بڑا جوش تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا۔ تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ ناآشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کی گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی راحت بخش گرمی، مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی ——— اس نے رات میں کئی بار دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آوازیں ——— وہ تصویریں کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کر دیتیں۔ وہ خود کو ننگا محسوس کرتا۔ الف ننگا جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صبح چار بجے کے قریب وہ اٹھا، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا، کچھ سوچا، وہ جھجک جو اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی اس کو کسی قدر دور کیا، اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، جو کافی تیز تھی — بھولو کی نگاہیں کونے کی طرف مڑیں، کلن کا گھسا ہوا ٹاٹ ہل رہا تھا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل ننگ دھڑنگ لیٹا تھا، بھولو کو بڑی گھن آئی، ساتھ ہی غصہ بھی آیا، کہ یہ ہوا ایسے کوٹھوں پر کیوں چلتی ہے — چلتی ہے تو ٹاٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے، اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں، سب نوچ ڈالے اور ننگا ہو کر ناچنے لگے۔"

بھولو نیچے اتر گیا، جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے، سب نے اس سے پہلی رات کی سرگذشت پوچھی، بھوجے درزی نے اس کو دور ہی سے آواز دی، کیوں استاد بھولو کیسے رہے، کہیں ہمارے نام پر بٹہ تو نہیں لگا دیا تم نے۔"

چھاگے ٹین ساز نے اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا دیکھو اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتا دو، ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔"

بالے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپا مارا — "دیکھو لپہلوان کیسا رہا دنگل؟"

بھولو خاموش رہا۔

صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی، پانچ چھ روز کے بعد واپس آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا سامنا پڑا، کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے، چند راتیں خاموشی

رہی تھی لیکن جب وہ اوپر سوئے تو وہی کھسر پھر ــــ وہی چر چوں چر چوں وہی گلا سنا کھنکارنا ــــ وہی گھڑے کے ساتھ گلاس کے ٹکرانے کے چھناکے ــــ کروٹوں پر کروٹیں ــــ

ــــ بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر آسمان کی طرف دیکھتا رہا، کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دلہن کو دیکھ لیتا، اور دل میں کڑھتا "مجھے کیا ہو گیا ہے ــــ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

سات آٹھ دن تک یہی ہوتا رہا۔ آخر تنگ آکر بھولو نے اپنی دلہن کو میکے بھیج دیا۔ بیس پچیس دن گذر گئے تو گاما نے بھولو سے کہا۔ "یار تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہو، نئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیج دیا اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے تم اکیلے سوتے کیسے ہو؟"

بھولو نے صرف اتنا کہا "ٹھیک ہے؟"

گاما نے پوچھا "ٹھیک کیا ہے، جو بات ہے بتاؤ۔ کیا تمہیں پسند نہیں آئی عائشہ؟"

"یہ بات نہیں ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟"

بھولو بات گول کر گیا، مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی، بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا اندر سے اس کو اپنی بھابی کی آواز سنائی دی، وہ گاما سے کہہ رہی تھی تم جو کہتے ہو کہ بھولو کو عائشہ پسند نہیں آئی یہ غلط ہے۔"

گاما کی آواز آئی۔ "تو اور کیا بات ہے ــــ بھولو تو اس سے کوئی

دلچسپی ہی نہیں۔"

"دلچسپی کیا ہو۔"

"کیوں؟"

گاما کی بیوی کا جواب بھولو نہ سن سکا، مگر اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہے ایک "بھابی اونچی آواز میں بولی" عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے کہا — بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی۔"

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گاما نے کہا "یہ تو بہت برا ہوا۔"

بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہو گئی، اس کا دماغی توازن بگڑ گیا، اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ لگے تھے، اکھیڑنے شروع کر دیئے، کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سنکر لوگ جمع ہو گئے انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا، بات بڑھ گئی، کلن نے بانس اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا، بھولو چکرا کر گر گیا، اور بے ہوش ہو گیا، جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔

اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔"

جانکی

پونہ میں ریسوں کا موسم شروع ہونے والا تھا کہ پشاور سے عزیز نے لکھا کہ میں اپنی ایک جان پہچان کی عورت جانکی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں اس کو یا تو پونا میں یا بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں ملازم کرا دو تمہاری واقفیت کافی ہے امید ہے تمہیں زیادہ دقت نہ ہو گی۔

دقت کا اتنا زیادہ سوال نہیں تھا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا، فلم کمپنیوں میں اکثر وہی آدمی عورتیں لے کر آتے ہیں جنہیں ان کی کمائی کھانا ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ میں بہت گھبرایا! لیکن پھر میں نے سوچا عزیز اتنا پرانا دوست ہے، جانے کس یقین کے ساتھ بھیجا ہے، اس کو مایوس نہیں کرنا چاہیئے، یہ سوچ کر بھی ایک گونہ تسکین ہوئی کہ عورت کے لئے اگر وہ جوان ہو ہر فلم کمپنی کے دروازے کھلے ہیں اتنی تردد کی بات ہی کیا ہے، میری مدد کے بغیر ہی اسے کسی نہ کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے گی۔"

خط ملنے کے چوتھے روز وہ پونہ پہنچ گئی، کتنا لمبا سفر طے کر کے آئی تھی، پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پونہ، پلیٹ فارم پر چونکہ اس کو مجھے پہچانتا تھا، اس لئے گاڑی آنے پر میں نے ایک سرے سے ڈبوں کے پاس

سے گذرنا شروع کیا، مجھے زیادہ دور نہ چلنا پڑا، کیونکہ سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک متوسط قد کی عورت جس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی اتری،، میری طرف پیٹھ کرکے وہ کھڑی ہو گئی، اور ایڑیاں اونچی کرکے ہجوم میں مجھے تلاش کرنے لگی، میں نے قریب جاکر کہا "جسے آپ ڈھونڈ رہی ہیں وہ غالباً میں ہی ہوں "

وہ پلٹی "اوہ آپ" ایک نظر میری تصویر کی طرف دیکھا، اور بڑے بے تکلف انداز میں کہا "سعادت صاحب سفر بہت ہی لمبا تھا، بمبئی میں فرنٹیر میل سے اتر کر اس گاڑی کے انتظار میں جو وقت کاٹنا پڑا اس نے طبیعت صاف کر دی "

میں نے کہا" اسباب کہاں ہے آپ کا ؟"

لاتی ہوں" یہ کہہ کر وہ ڈبے کے اندر داخل ہوئی وہ سوٹ کیس اور ایک بستر نکالا، میں نے قلی بلوایا، اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

"میں ہوٹل میں ٹھہروں گی"

میں نے اسٹیشن کے سامنے ہی اس کے لئے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا اسے غسل وسل کرکے کپڑے تبدیل کرنے تھے، اور آرام کرنا تھا، اس لئے میں نے اسے اپنا ایڈریس دیا، اور یہ کہہ کر کہ صبح دس بجے مجھ سے ملے ہوٹل سے چل دیا۔

صبح ساڑھے دس بجے وہ پربھات نگر، جہاں میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، آئی، جگہ تلاش کرتے ہوئے اسے دیر ہو گئی تھی میرا دوست اس چھوٹے سے فلیٹ میں جو نیا بنایا تھا موجود نہیں تھا

میں رات دیر تک لکھنے کا کام کرنے کے باعث صبح دیر سے جاگا تھا اس لئے ساڑھے دس بجے نہا دھو کر چائے پی رہا تھا کہ وہ اچانک اندر داخل ہوئی۔

پلیٹ فارم پر اور ہوٹل میں تھکاوٹ کے باوجود وہ جاندار عورت تھی، مگر جونہی وہ اس کمرے میں جہاں میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے چائے پی رہا تھا، داخل ہوئی، تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت ہی خستہ حال اور پریشان عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔"

جب میں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا، تو وہ زندگی سے بھرپور تھی لیکن جب پربھات نگر کے نمبر گیارہ فلیٹ میں آئی تو مجھے محسوس ہوا، گویا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دیدیا ہے، یا اس کا اسقاط ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں، گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا سوائے ایک بیرے کے جو کہ جن کا ذکر کئے، میرے دوست کا گھر جس میں ایک فلمی کہانی لکھنے کے لئے ٹھہرا ہوا تھا، بالکل سنسان تھا اور مجید ایک ایسا نوکر تھا جس کی موجودگی ویرانی میں اضافہ کرتی تھی۔"

میں نے چائے کی ایک پیالی بنا کر جانکی کو دی اور کہا "ہوٹل سے تو آپ ناشتہ کر کے آئی ہوں گی، پھر بھی نوش فرمائیے۔"

اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی اور پینا شروع کی، اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی، اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن ہچکچاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کو

کسی مسافر نے اسے چھیڑا ہے، چنانچہ میں نے کہا: "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہوٹل میں؟"

"جی ... جی نہیں۔"

میں یہ مختصر جواب سنکر خاموش رہا۔ چائے ختم ہوئی تو میں نے سوچا، اب کوئی بات کرنی چاہیئے، چنانچہ میں نے پوچھا: "عزیز صاحب کیسے ہیں"؟

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا، چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی، اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا "منٹو صاحب آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں"؟

میں نے جواب دیا: "پونہ میں تو کسی کو نہیں جانتا۔"

اوہ!

میں نے پوچھا: "کیوں۔ کیا بیمار ہیں آپ"؟

"جی ہاں" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دریافت کیا، "کیا تکلیف ہے"؟

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے وقت سکڑ جاتے تھے یا سکیڑ لیے جاتے تھے وا ہوئے، اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کہہ نہ سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی، پھر میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر کہا: "معاف کیجئے گا میں سگریٹ پیا کرتی ہوں۔"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سگریٹ پیا ہی نہیں کرتی تھی، بلکہ پھونکا کرتی تھی، بالکل مردوں کی طرح سگریٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی، اور ایک دن میں تو پچاس سگریٹوں کا دھواں کھینچتی تھی

میں نے کہا: "آپ بتاتی کیوں نہیں ہو کہ آپ کو تکلیف کیا ہے؟"
اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجلا کر اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا ـــــ "ہائے اللہ، میں کیسے بتاؤں آپ کو" یہ کہہ کر وہ مسکرائی مسکراتے ہوئے تیکھے ہونٹوں کی محراب میں سے مجھے اس کے دانت نظر آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے، وہ بیٹھ گئی، اور میری آنکھوں میں اپنی ڈگمگاتی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا بات یہ ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ...."
پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا، لیکن جب بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا: "ایسا اکثر ہوتا ہے؟"
اس نے زور سے کش لیا اور مردوں کی طرح زور سے دھوئیں کو باہر نکالتے ہوئے کہا: "نہیں، یہاں معاملہ کچھ اور ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ ٹھہر نہ گیا ہو۔"
میں نے کہا: "اوہ"!
اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردن چائے کی طشتری میں دبائی: "اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہوگی، ایک دفعہ پشاور میں ایسی ہی گڑبڑ ہو گئی تھی، لیکن عزیز صاحب اپنے حکیم دوست سے ایسی دوا لائے تھے، جس سے چند ہی دنوں میں سب صاف ہو گیا تھا
میں نے پوچھا: "آپ کو بچے پسند نہیں۔"
وہ مسکرائی: "پسند ہیں ـــــ لیکن کون پالتا پھرے؟"
میں نے کہا: "آپ کو معلوم ہے، اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے
وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی، پھر اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا

"مجھ سے عزیز صاحب نے یہی کہا تھا، لیکن سعادت صاحب میں پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کون سی بات ہے اپنی ہی تو چیز ہے، اور ان قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف کتنی ہوتی ہے۔ بڑا جرم ہے۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا "عجیب و غریب عورت ہو تم جانکی۔"

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کیا "عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے ہیں۔"

ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، میرا مشاہدہ ہے جو آدمی پُر خلوص ہوں، ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ جاتے ہیں اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا، اور آنکھیں خشک کر کے بھولے بچوں کے انداز میں پوچھا۔

سعادت صاحب بتایئے، کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں؟

میں نے کہا "بہت۔"

"جھوٹ"

"اس کا ثبوت"

اس نے سگریٹ سلگانا شروع کر دیا "بھئی شاید ایسا ہو میں تو اتنا ہی جانتی ہوں کہ کچھ بیوقوف ہوں، زیادہ بولتی ہوں زیادہ ہنستی ہوں ــــ اب آپ ہی دیکھئے نا، زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے عزیز صاحب ہمیشہ کہتے رہے "جانکی کم کھایا کرو۔" پر میں نے ان کی ایک نہ سنی ــــ سعادت صاحب بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں۔"

اس کا.... پھر ہنسنا شروع ہو گیا، میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا

اس کی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھی بیچ بیچ میں گھنگرو سے بجتے تھے۔

پھر وہ اسقاط حمل کے متعلق باتیں شروع کرنے ہی والی تھی کہ میرا دوست جس کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، آگیا، میں نے جانکی سے اس کا تعارف کرایا، اور بتایا کہ وہ فلم لائن میں آنے کا شوق رکھتی ہے میرا دوست اسے اسٹوڈیو لے گیا، کیونکہ اس کو یقین تھا، کہ وہ ڈائرکٹر جس کے ساتھ وہ بحیثیت اسسٹنٹ کام کر رہا تھا، اپنے نئے فلم میں جانکی کو ایک خاص رول کے لئے ضرور لے لیگا۔

پونہ میں جتنے اسٹوڈیو تھے، میں نے مختلف ذرائع سے جانکی کیلئے کوشش کی کسی نے اس کا سیاؤنڈ ٹسٹ لیا، کسی نے کیمرہ ٹسٹ ایک فلم کمپنی میں اس کو مختلف قسم کے لباس پہنا کر دیکھا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا، ایک تو جانکی ویسے ہی دن اوپر جانے کے باعث پریشان تھی چار پانچ روز متواتر جب اسے مختلف قسم کی فلم کمپنیوں کے اکتا دینے والے ماحول میں بے نتیجہ گزارنے پڑے تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ بچہ ضائع کرنے کے لئے وہ ہر روز بیس بیس گرین کونین کھاتی تھی، اس سے بھی اس کی طبیعت پر گرانی رہتی تھی، عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گزرتے ہیں، اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی، پونہ پہنچتے ہی اس نے ایک تار بھیجا تھا، اس کے بعد وہ بلا ناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی، ہر خط میں یہ تاکید ہوتی تھی، کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔

عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی، اس کا مجھے علم نہیں، لیکن

جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے اس لئے وہ فوراً اس کا کہنا مان لیتے ہیں، گھر میں کئی بار بیوی سے ان کا جھگڑا ہوا کہ وہ دوا نہیں پیتے، لیکن جانکی سے اس معاملہ میں انھوں نے کبھی چوں بھی نہ کی۔

شروع میں میرا خیال تھا، کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکرمند رہتی ہے محض بکواس ہے، بناوٹ ہے، لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے اس کا جب بھی خط آیا، جانکی پڑھ کے ضرور روئی۔

فلم کمپنیوں کے طواف کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، لیکن ایک روز جانکی کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا اندیشہ غلط تھا، دن زیادتی اوپر ہو گئے تھے، لیکن وہ بات جس کا اسے کھٹکا تھا نہیں تھی۔

جانکی کو پونہ آئے جیں روز ہو چلے تھے، عزیز کو وہ خط پر خط لکھ رہی تھی، اس کی طرف سے بھی لمبے لمبے محبت نامے آتے تھے، ایک خط میں عزیز نے مجھ سے کہا تھا کہ پونہ میں اگر جانکی کے لئے کچھ نہیں ہوتا تو میں بمبئی کی کوشش کروں، کیونکہ وہاں بے شمار اسٹوڈیو ہیں بات معقول تھی، لیکن میں سینریو لکھنے میں مصروف تھا، اس لئے جانکی کے ساتھ میرا بمبئی جانا بہت مشکل تھا لیکن میں نے پونہ سے اپنے دوست سعید کو جو ایک فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا ٹیلیفون کیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت اسٹوڈیو میں موجود نہیں تھا، آفس میں نرائن کھڑا تھا، اسے جب معلوم ہوا کہ میں پونہ سے بول رہا ہوں تو ٹیلی فون لے لیا اور زور سے چلایا۔

ہلو ہلو .... نرائن سپکنگ فرام دس اینڈ .... کہو کیا بات ہے، سعید، اس وقت اسٹوڈیو میں نہیں ہے، گھر میں بیٹھا رضیہ سے آخری حساب کتاب کر رہا ہے ......"

میں نے پوچھا کیا مطلب۔"

نرائن نے ادھر سے جواب دیا "کھٹ پٹ ہو گئی ہے ان میں رضیہ نے ایک اور آدمی سے ٹانکا ملا لیا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن یہ حساب کتاب کیسا ہو رہا ہے"؟

نرائن بولا "بڑا کمینہ ہے یار سعید ــــ اس سے کپڑے لے رہا ہے جو اس نے خرید کے دئیے تھے۔ ــــ خیر چھوڑو اس بات کو تباؤ بات کیا ہے"؟

میں نے اس سے کہا "بات یہ ہے کہ پشاور سے میرے ایک عزیز نے ایک عورت یہاں بھیجی ہے جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔"

جانکی میرے پاس ہی کھڑی تھی، میں نے محسوس کیا کہ میں نے مناسب و موزوں لفظوں میں اپنا مدعا بیان نہیں کیا۔

میں تصحیح کرنے ہی والا تھا، کہ نرائن کی بلند آواز کانوں کے اندر گھسی ــــ عورت؟ ــــ پشاور کی خوب، اس کو جلدی ــــ خوہم بھی تصور کا پٹھان ہے۔"

میں نے کہا، بکواس نہ کرو نرائن، سنو، کل دکن کوئن سے میں انہیں بھی بھیج رہا ہوں، سعید یا تم کوئی بھی اسے اسٹیشن پر لینے کے لئے آجانا ــــ کل دکن کوئن سے یاد رہے۔"

نرائن کی آواز آئی "پر ہم اسے پہچانیں گے کیسے؟"
میں نے جواب دیا "وہ خود تمہیں پہچان لے گی، لیکن دیکھو کوشش کر کے اسے کسی نہ کسی جگہ ضرور دکھوا دینا۔"
تین منٹ گذر گئے، میں نے ٹیلی فون بند کیا، اور جانکی سے کہا کل دکن کوئین سے تم بمبئی چلی جانا۔ سعید اور نرائن دونوں کی تصویریں میں دکھاتا ہوں، لمبے تڑنگے خوبصورت جوان ہیں، تمہیں پہچاننے میں دقت نہیں ہوگی۔"
میں نے البم میں جانکی کو سعید اور نرائن کے مختلف فوٹو دکھلائے دیر تک وہ انہیں دیکھتی رہی، میں نے نوٹ کیا کہ سعید کا فوٹو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔"
البم ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنے کی ڈگمگاتی کوشش کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔ دونوں کیسے آدمی ہیں" ؟
کیا مطلب"؟
"مطلب یہ کہ دونوں کیسے آدمی ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ فلموں میں اکثر آدمی برے ہوتے ہیں"؟
اس کے لہجہ میں ایک عورت لینے والی سنجیدگی تھی۔
میں نے کہا" یہ تو درست ہے، لیکن فلموں میں نیک آدمیوں کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے"۔
"کیوں"؟
"دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں ایک قسم ان انسانوں کی ہے جو اپنے زخموں سے درد کا اندازہ کرتے ہیں ___ دوسری قسم ان کی ہے

جو دوسروں کے زخم دیکھ کر درد کا اندازہ کرتے ہیں، تمہارا کیا خیال ہے، کون سی قسم کے انسان زخم کے درد اور ان کی جلن کو صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں؟"

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا" وہ جن کے زخم لگے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا" بالکل درست، فلموں میں اصل کی اچھی نقل وہی اتار سکتا ہے، جیسے اصل سے واقفیت ہو، ناکام محبت میں دل کیسے ٹوٹتا ہے یہ ناکام محبت ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے، وہ عورت جو پانچ وقت جانماز بچھا کر نماز پڑھتی ہے اور عشق و محبت کو کفر کے برابر سمجھتی ہے، کیمرے کے سامنے کسی مرد کے ساتھ اظہار محبت کیا خاک کرے گی۔"

اس نے پھر سوچا" اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلم لائن میں داخل ہونے سے پہلے عورت کو سب چیزیں جاننی چاہئیں۔"

میں نے کہا" یہ ضروری نہیں، فلم لائن میں آکر بھی وہ یہ چیزیں جان سکتی ہے۔"

اس نے میری بات پر غور نہ کیا، اور جو پہلا سوال کیا تھا پھر اسے دہرایا۔

سعید صاحب اور نرائن صاحب کیسے آدمی ہیں؟"

"تم تفصیل سے پوچھنا چاہتی ہو؟"

"تفصیل سے آپ کا کیا مطلب؟"

"یہ کہ دونوں میں سے آپ کے لئے کون بہتر رہے گا"؟

جانکی کو میری یہ بات ناگوار گذری۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟

"جیسی تم چاہتی ہو۔"

ہٹائیے بھی" یہ کہہ کر وہ مسکرائی" میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھونگی

میں نے مسکراتے ہوئے کہا" جب پوچھوگی تو میں نرائن کی سفارش کروں گا۔

"اس لئے کہ وہ سعید کے مقابلے میں بہتر انسان ہے۔"

" میرا اب بھی یہی خیال ہے سعید شاعر ہے، ایک بے رحم قسم کا شاعر، مرغی پکڑے گا تو ذبح کرنے کے بجائے اس کی گردن مروڑ دے گا گردن مروڑ کر اس کے پر نوچے گا، پر نوچنے کے بعد اس کی یخنی نکالیگا یخنی پی کر اور ہڈیاں چبا کر وہ بڑے آرام اور سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر اسی مرغی کی موت پر ایک نظم لکھے گا، جو اس کے آنسوؤں میں بھیگی ہوگی۔

شراب پیئے گا، تو کبھی بہکے گا نہیں، مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ شراب کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے صبح بہت آہستہ آہستہ اپنے بستر پر سے اٹھے گا، نوکر چائے کی پیالی بنواکر پیلے گا اگر رات کی بچی ہوئی رم سرہانے پڑی ہے تو اسے چائے میں انڈیل لیگا اور اس مکسچر کو ایک ایک گھونٹ کر کے ایسے پیئے گا جیسے اس میں ذائقہ کی کوئی حس ہی نہیں۔

بدن پر کوئی پھوڑا نکلا ہے۔ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے مگر مجال ہے جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو، پیپ نکل رہی ہے گل سڑ

گیا ہے، ناسور بننے کا خطرہ ہے، لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا، آپ اس سے کچھ کہیں گے، تو یہ جواب ملے گا اکثر اوقات بیماریاں انسان کی جز بدن ہو جاتی ہیں، جب مجھے یہ زخم تکلیف نہیں دیتا تو علاج کی کیا ضرورت ہے؟" اور یہ کہتے ہوئے وہ زخم کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے کوئی بڑا اچھا شعر نظر آ گیا ہے۔

ایکٹنگ وہ ساری عمر نہیں کر سکے گا، اس لئے کہ وہ لطیف جذبات سے قریب قریب عاری ہے میں نے اسے ایک فلم میں دیکھا جو ہیروئن کے گانوں کے باعث بہت مقبول ہوا تھا، ایک جگہ اسے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت کا اظہار کرنا تھا، خدا کی قسم اس نے ہیروئن کا ہاتھ کچھ اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا، جیسے کتے کا پنجا پکڑا جاتا ہے، میں اس سے کئی بار کہہ چکا ہوں ایکٹر بننے کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اچھے شاعر ہو، گھر بیٹھ اور نظمیں لکھا کرو، مگر اس کے دماغ پر ابھی تک ایکٹنگ کی دھن سوار ہے۔

نرائن مجھے بہت پسند ہے اسٹوڈیو کی زندگی کے جو اصول اس نے اپنے لئے وضع کر رکھے ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں۔

(۱) ایکٹر جب تک ایکٹر ہے اسے شادی نہیں کرنی چاہیئے شادی کرے تو فوراً فلم کو طلاق دیکر دودھ دہی کی دوکان کھول لے، اگر مشہور ایکٹر رہا ہے تو کافی آمدنی ہو جایا کرے گی۔

(۲) کوئی ایکٹرس تمہیں بھیا یا بھائی صاحب کہے تو تم فوراً اس کے کان میں کہو۔ آپ کی انگیا کا کیا سائز ہے؟"

(۳) کسی ایکٹریس پر اگر تمہاری طبیعت آگئی ہے تو تمہید باندھنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اس سے تخلئے میں ملو اور کہو: "میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔" اس کو یقین نہ آئے تو پوری جیب باہر نکال کر دکھا دو۔

(۴) اگر کوئی ایکٹریس تمہارے حصہ میں آجائے تو اس کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی نہ لو۔ ایکٹرسوں کے شوہروں اور بھائیوں کے لئے یہ پیسہ حلال ہے۔

(۵) اس بات کا خیال رکھنا کہ ایکٹرس کے بطن سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔ سوراج ملنے کے بعد البتہ تم اس قسم کی اولاد پیدا کر سکتے ہو۔

(۶) یاد رکھو کہ ایکٹر کی بھی عاقبت ہوتی ہے۔ اسے ریزر اور کنگھی سے سنوارنے کی بجائے کبھی کبھی غیر مہذب طریقے سے بھی سنوارنے کی کوشش کیا کرو۔ مثال کے طور پر کوئی نیک کام کر کے۔

(۷) سٹوڈیو میں سب سے زیادہ احترام پٹھان چوکیدار کا کرو صبح سٹوڈیو میں آتے وقت اسے سلام کرنے سے تمہیں فائدہ ہوگا۔ یہاں نہیں دوسری دنیا میں۔ جہاں فلم کمپنیاں نہیں ہوں گی۔

(۸) شراب اور ایکٹریس کی عادت ہرگز نہ ڈالو۔ بہت ممکن ہے کسی روز کانگرس گورنمنٹ لہر میں آکر یہ دونوں چیزیں ممنوع قرار دیدے

(۹) سوداگر مسلمان سوداگر ہو سکتا ہے، لیکن ایکٹر ہندو ایکٹر

یا مسلم ایکٹر نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) جھوٹ نہ بولو۔

یہ سب باتیں نرائن کے دس احکام" کے عنوان تلے اس نے ایک نوٹ بک میں لکھ رکھی ہیں۔ جن سے اس کے کیریکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ان سب پر عمل نہیں کرتا۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔

سعید اور نرائن کے متعلق جو میرے خیالات تھے میں نے جانکی کے پوچھے بغیر اشارۃً بتا دیئے اور آخر میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر تم اس لائن میں آ گئیں تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمہیں لینا ہی پڑے گا۔ نرائن کے متعلق میرا خیال ہے کہ اچھا دوست ثابت ہو گا۔

میرا مشورہ اس نے سن لیا اور بمبئی چلی گئی دوسرے روز خوش خوش واپس آئی۔ کیونکہ نرائن نے اپنے سٹوڈیو میں ایک سال کے لئے پانچ سو روپے ماہوار پر اسے ملازم کرا دیا تھا یہ ملازمت اسے کیسے ملی۔ دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئیں جب اور کچھ سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "سعید اور نرائن دونوں سے تمہاری ملاقات ہوئی۔ ان میں سے کس کو تم نے زیادہ پسند کیا۔"

جانکی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا: "سعید صاحب کو" یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "سعادت صاحب آپ نے

کیوں اتنے پل باندھے تھے نرائن کی تعریفوں کے ؟"

بڑا ہی واہیات آدمی ہے ــــ شام کو باہر کرسیاں بچھاکر سعید صاحب اور وہ شراب پینے کے لئے بیٹھے۔ تو باتوں باتوں ہی میں نے نرائن بھیا کہا۔ اپنا منہ میرے کان کے پاس لاکر اس نے مجھ سے پوچھا۔ " تمہاری انگیا کا کیا سائز ہے۔" بھگوان جانتا ہے میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی ــــ کیسا لچرآدمی ہے۔"

جانکی کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس نے تیزی سے کہا۔" آپ کیوں ہنس رہے ہیں۔؟"

" اس کی بیوقوفی پر۔" یہ کہہ کر میں نے ہنسنا بند کردیا۔

تھوڑی دیر نرائن کو برا بھلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکرمند لہجے میں باتیں شروع کردیں۔ کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ اس لئے طرح طرح کے خیالات اسے ستا رہے تھے۔ کہیں انہیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو ــــ اندھا دھند سائیکل چلاتے ہیں۔ کہیں حادثہ ہی نہ ہو گیا ہو۔ پونا ہی نہ آرہے ہوں۔ کیونکہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا تھا۔ ایک روز میں چپ چاپ تمہارے پاس چلا آؤں گا۔

باتیں کرنے کے بعد جب اس کا تردد کم ہوا۔ تو اس نے عزیز کی تعریفیں شروع کردیں۔ گھر میں بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہر روز صبح ان کو ورزش کراتے ہیں۔ اور نہلا دھلا کر اسکول چھوڑنے

جاتے ہیں۔ بیوی بالکل پھوہڑ ہے۔ اس لئے رشتہ داروں سے سارا رکھ رکھاؤ خود انہیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ جانکی کو ٹائی فائڈ ہوگیا تھا۔ تو بیس دن تک متواتر نرسوں کی طرح تیمارداری کرتے رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے روز مناسب و موزوں الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی۔ جہاں اس کے لئے ایک نئی اور چمکیلی دنیا کے دروازے کھل گئے تھے۔

پونہ میں مجھے تقریباً دو مہینے کہانی کا منظر نامہ تیار کرنے میں لگے حق الخدمت وصول کرکے میں نے بمبئی کا رخ کیا۔ جہاں مجھے ایک نیا کنٹریکٹ مل رہا تھا۔

میں صبح پانچ بجے کے قریب اندھیری پہنچا۔ جہاں ایک معمولی بنگلہ میں سعید اور نرائن دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ برآمدے میں داخل ہوا تو دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سو رہے ہوں گے تکلیف نہیں دینا چاہیئے۔ پچھلی طرف ایک دروازہ ہے جو نوکروں کے لئے اکثر کھلا رہتا ہے۔ میں اس میں سے اندر داخل ہوا۔ باورچی خانہ اور ساتھ والا کمرہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہے حسب معمول بے حد غلیظ تھا۔ سامنے والا کمرہ مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے ایک پر سعید اور اس کے ساتھ کوئی اور لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔

مجھے سخت نیند آرہی تھی۔ دوسرے پلنگ پر میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا۔ پائینتی پر کمبل پڑا تھا۔ یہ میں نے ٹانگوں پر

ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سعید کے پیچھے سے ایک چوڑیوں والا بازو نکلا اور پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔ کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا ـــ سعید کے ساتھ جانکی لیٹی تھی۔ میں نے کرسی پر سے شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔

نرائن کے کمرے میں جا کر میں نے اسے جگایا۔ رات کے دو بجے اس کی شوٹنگ ختم ہوئی تھی مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اس غریب کو جگایا۔ لیکن وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ صبح ۹ بجے تک ہم بیہودہ بکواس میں مشغول رہے۔ جس میں بار بار جانکی کا بھی ذکر آیا۔

جب میں نے انگیا والی بات چھیڑی تو نرائن بہت ہنسا۔ ہنستے ہنستے اس نے کہا "سب سے مزے دار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا، تمہاری انگیا کا کیا سائز ہے تو اس نے بتا دیا۔ کہا "چوبیس۔"

اس کے بعد اچانک اسے میرے سوال کی بے ہودگی کا احساس ہوا۔ اور مجھے کوسنا شروع کر دیا ـــ بالکل بچی ہے۔ جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ تو سینہ پر دوپٹہ کھسکا لیتی ہے۔ لیکن منٹو، بڑی وفادار عورت ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ تم نے کیسے جانا۔"؟

نرائن مسکرایا "عورت جو ایک بالکل اجنبی آدمی کو اپنی انگیا کا صحیح سائز بتا دے دھوکہ باز ہرگز نہیں ہو سکتی۔"

عجیب و غریب منطق تھی۔ لیکن نرائن نے مجھے بڑی سنجیدگی سے

یقین دلا یا کہ جانکی بڑی پرخلوص عورت ہے۔ اس نے کہا: منٹو تمہیں معلوم نہیں سعید کی کتنی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبرگیری جو پرلے درجہ کا بے پروا ہو، آسان کام نہیں۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کو بڑی آسانی سے نبھا رہی ہے عورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پرخلوص اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صبح اٹھ کر اس کو جگانے میں آدھا گھنٹہ صرف کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کراتی ہے۔ کپڑے پہناتی ہے، ناشتہ کراتی ہے۔ اور رات کو جب وہ رم پی کر بستر پر لیٹتا ہے تو سب دروازے بند کر کے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے ـــــ اور جب سٹوڈیو میں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید کی باتیں کرتی ہے سعید صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ سعید صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں سعید صاحب کا وزن بڑھ گیا ہے۔ سعید صاحب کا پل اوور تیار ہو گیا ہے۔ سعید صاحب کے لیے پشاور سے بوکھو ماری سینڈل منگوائی ہے۔ سعید صاحب کے سر میں آج ہلکا ہلکا درد ہے۔ اسپرو لینے جا رہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر ایک شعر کہا ـــ اور جب مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ تو انگیا والی بات یاد کر کے تیوری چڑھا لیتی ہے ـــ ٭ میں تقریباً دس دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا۔ اس دوران میں سعید نے جانکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ شاید اس لیے کہ ان کا معاملہ کافی پرانا ہو چکا تھا۔ جانکی سے البتہ کافی باتیں ہوئیں وہ سعید سے بہت خوش تھی۔ لیکن اسے اس کی بے پروا طبیعت کا بہت گلہ تھا۔ یہ سعادت صاحب! اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ بہت بے پروا ہیں۔ ہر وقت سوچتا جو ہوا اس لئے کسی بات کا خیال ہی

نہیں رہتا۔ آپ ہنسیں گے۔ لیکن مجھے ہر روز اما سے پوچھنا پڑتا ہے۔ کہ آپ سنڈاس گئے تھے یا نہیں۔"

نرائن نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا ٹھیک نکلا۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری ہی میں منہمک رہتی تھی۔ میں دس دن اندھیری کے بنگلے میں رہا۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کا کیا ہوا۔ جانکی کو اس کا کبھی تو بہت خیال رہتا تھا کیا سعید کو پا کر وہ اس کو بالکل بھول چکی تھی —— میں نے اس سوال کا جواب جانکی ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا۔ جس کمپنی سے میرا کنٹریکٹ ہونے والا تھا اس کے مالک سے میری کسی بات پر چخ ہو گئی اور میں دماغی تکدر دور کرنے کے لئے پونہ چلا گیا۔

دو ہی دن گذرے ہوں گے کہ بمبئی سے عزیز کا تار آیا کہ میں آرہا ہوں۔ پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پر دستک دے رہی تھی۔

عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انہوں نے دیر سے بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق کی سرگرمی ظاہر نہ کی۔ میرے اور عزیز کے تعلقات شروع سے بہت سنجیدہ اور متین رہے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ دونوں معتدل رہے۔

عزیز کا خیال تھا ہوٹل میں اٹھ جائے۔ لیکن میرا دوست جس کے یہاں میں ٹھہرا تھا۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے کولہا پور گیا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے عزیز اور جانکی کو اپنے پاس ہی رکھا۔ تین کمرے تھے۔ ایک میں جانکی سو سکتی تھی۔ دوسرے میں عزیز یوں تو مجھے ان دونوں

کو ایک ہی کمرہ دینا چاہیے تھا۔ لیکن عزیز سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی اس کے علاوہ اس نے جانکی سے اپنے تعلق کو مجھ پر ظاہر کبھی نہیں کیا تھا۔

رات کو دونوں سینما دیکھنے چلے گئے۔ میں ساتھ نہ گیا۔ اس لئے کہ میں فلم کے لئے ایک نئی کہانی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دو بجے تک میں جاگتا رہا اس کے بعد سو گیا۔ ایک چابی میں نے عزیز کو دیدی تھی اس لئے مجھے ان کی طرف سے اطمینان تھا۔

رات کو چاہے میں بہت دیر تک کام کروں، ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک دفعہ ضرور جاگتا ہوں۔ اور اٹھ کر پانی پیتا ہوں اتفاق سے جو کمرہ میرا تھا۔ یعنی جس میں میں نے اپنا بستر جمایا ہوا تھا۔ عزیز کے پاس تھا۔ اور اس میں میری صراحی پڑی تھی۔

اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا لیکن زیادہ وسکی پینے کے باعث میرا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اس لئے مجھے دستک دینی ہی پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ اور کہا۔ "سعید صاحب!" اور جب مجھے دیکھا تو ایک ہلکی سی "اوہ" اس کے منہ سے نکل گئی۔

اندر پلنگ پر عزیز سو رہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ جانکی بھی مسکرائی اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے میں نے پانی کی صراحی لی اور چلا آیا۔

صبح اٹھا تو کمرے میں دھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کا غذ جلا جلا کر عزیز کے غسل کے لئے پانی گرم کر رہی تھی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگیٹھی میں پھونکیں

مارتی ہوئی کہنے لگی :" عزیز صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انہیں زکام ہو جاتا ہے ۔ میں نہیں تھی پشاور میں تو ایک مہینہ بیمار رہے ۔ اور بہتے بھی کیوں نہیں جب دوا پینی ہی چھوڑ دی تھی ——— آپ نے دیکھا نہیں کتنے دبلے ہو گئے ہیں ۔"

اور عزیز نہا دھو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھ سے سعید کے نام تار لکھنے کے لئے کہا ۔" مجھے کل یہاں پہنچتے ہی تار بھیجنا چاہیئے تھا ——— کتنی غلطی ہوئی مجھ سے ۔ انہیں بہت تشویش ہو رہی ہوگی ۔"

اس نے مجھ سے تار کا مضمون بنوایا ۔ جس میں اپنی بخیریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی ، لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا ۔ انجکشن لگوانے کی بھی تاکید تھی ۔

چار روز گذر گئے جانکی نے سعید کو پانچ تار روانہ کئے پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا ۔ بمبئی جانے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اچانک شام کو عزیز کی طبیعت خراب ہو گئی ۔ مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیز کی تیمارداری میں مصروف رہی ۔ معمولی بخار تھا لیکن جانکی کو بیحد تشویش تھی ۔ میرا خیال ہے اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کردہ اضطراب بھی شامل تھا ۔ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی مرتبہ کہہ چکی تھی :" سعادت صاحب میرا خیال ہے کہ سعید صاحب ضرور بیمار ہیں ۔ ورنہ وہ مجھے میرے تاروں اور خطوں کا جواب ضرور لکھتے "

پانچویں روز شام کو عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا ۔ جس میں لکھا تھا " میں بہت بیمار رہیں فوراً چلی آؤ " تار آنے سے پہلے جانکی میری کسی بات

پہلے تماشہ ہنس رہی تھی۔ لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سنی تو ایک دم خاموش ہو گئی ۔ عزیز کو یہ خاموشی بہت ناگوار معلوم ہوئی کیونکہ جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ میں اٹھ کر چلا گیا۔

شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیز کچھ اس طرح علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی جھگڑا ہو چکا ہے۔ جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عزیز سے کہا میں جاتی ہوں۔ لیکن بہت جلد واپس آجاؤں گی۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئی: "سعادت صاحب ان کا خیال رکھیئے گا۔ ابھی تک بخار دور نہیں ہوا۔"

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی میں بٹھایا۔ اور گھر چلا آیا۔ عزیز کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ لیکن جانکی کا ذکر نہ آیا۔

تیسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد جانکی کی جلدی جلدی لفظوں کو اوپر تلے کرتی ہوئی آواز وہ عزیز سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اور کیا اس کی غیر موجودگی میں اس نے باقاعدہ دوا پی تھی یا نہیں۔ عزیز کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی۔ لیکن آدھے گھنٹے کے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مند رہی تھیں عزیز کی خفگی آمیز باتوں کا دبا دبا شور سنائی دیا۔ سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ جانکی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

صبح دس بجے عزیز نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جانکی کا گرم

کیا ہوا پانی ویسے ہی غسل خانے میں پڑا رہا۔ جب میں نے جانکی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

نہا دھو کر عزیز باہر چلا گیا۔ جانکی کمرے میں پلنگ پر لیٹی رہی۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب جب میں اس کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر کو بلانے کے لئے باہر نکلا تو عزیز تانگے میں اسباب رکھوا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو۔" تو اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اور کہا "بمبئی۔" انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔"

یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مجھے یہ بتانے کا موقعہ ہی نہیں ملا کہ جانکی کو بہت تیز بخار ہے۔"

ڈاکٹر نے جانکی کو اچھی طرح دیکھا اور مجھے بتایا کہ اسے برونکائٹس ہے اگر احتیاط نہ برتی تو نمونیا ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر نسخہ دیکر چلا گیا تو جانکی نے عزیز کے بارے میں پوچھا پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے نہ بتاؤں لیکن چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے کہہ دیا کہ چلا گیا ہے یہ سنکر اسے بہت صدمہ ہوا۔ دیر تک وہ تکئے میں سر دیکر روتی رہی۔

دوسرے روز صبح گیارہ بجے کے قریب جبکہ جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور طبیعت بھی کسی قدر درست تھی۔ بمبئی سے سعید کا تار آیا۔ جس میں بڑے درشت لہجہ میں یہ لکھا تھا " یاد رہے تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔" میں بہت منع کرتا رہا۔ لیکن وہ تیز بخار میں ہی پونہ ایکسپریس سے بمبئی روانہ ہو گئی۔

پانچ چھ دن کے بعد نرائن کا تار آیا "ایک ضروری کام ہے فوراً بمبئی چلے آؤ۔" میرا خیال تھا کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کنٹریکٹ

کی بات کی ہوگی۔ لیکن بمبئی پہنچکر معلوم ہوا کہ جانکی کی حالت بہت نازک ہے۔ برونکائٹس بگڑکر نمونیہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ پونہ سے بمبئی پہنچی تھی تو اندھیری جانے کے لئے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی۔ جس کے باعث اس کی دونوں رانیں بہت بری طرح چھل گئی تھیں۔

جانکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا لیکن جب وہ اندھیری پہنچی اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "مہربانی کرکے یہاں سے چلی جاؤ۔" تو اسے بہت ہی روحانی تکلیف ہوئی۔ نرائن نے مجھے بتایا" سعید کے منہ سے یہ برف جیسے ٹھنڈے الفاظ سنکر وہ ایک لحظے کے لئے بالکل سن ہو گئی۔ میرا خیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے بعد یہ ضرور سوچا ہوگا کہ میں گاڑی کے نیچے آکر کیوں نہ مر گئی ــــ سعادت تم کچھ بھی کہو۔ مگر سعید عورتوں سے جیسا سلوک کرتا ہے۔ بہت ہی نامردانہ ہے۔ بچاری کو بخار تھا۔ چلتی ٹرین سے گر پڑی تھی اور وہ کبھی اس خر ذات کے پاس جلدی پہنچنے کے باعث ــــــ لیکن اس نے ان باتوں کا خیال ہی نہ کیا اور ایک بار پھر اس سے کہا۔ مہربانی کرکے یہاں سے چلی جاؤ ــ اس کے لہجے میں منٹو کسی جذبہ کا اثر نہیں تھا ــ بس ایسا تھا جیسے لنوٹائپ مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر باہر نکل آئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو جانکی موجود نہیں تھی۔ لیکن سعید پلنگ پر بیٹھا رم کا گلاس سامنے رکھے ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا ــــــ میں نے اس سے کوئی بات

نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا ۔۔۔ دوسرے روز سٹوڈیو سے معلوم ہوا کہ جانکی ایک اکسٹرا لڑکی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ میں نے اسٹوڈیو کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوا دیا۔ کل سے وہیں ہے۔ بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ میں تو اسے دیکھنے جا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے ۔ تم جاؤ اور دیکھ کر آؤ کہ کس حالت میں ہے۔

میں ہسپتال گیا۔ تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا۔ جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد اس کے پرخلوص استفسار نے مجھے بہت متاثر کیا۔

اس کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ دونوں پھیپھڑوں پر ورم ہے اور جان کا خطرہ ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ جانکی اتنی بڑی تکلیف مردانہ وار برداشت کر رہی تھی۔

ہسپتال سے لوٹا اور سٹوڈیو میں نرائن کو تلاش کیا تو معلوم ہوا وہ صبح ہی سے کہیں غائب ہے۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے مجھے تین چھوٹی شیشیاں دکھائیں۔ جن کا منہ ربڑ سے بند تھا "جانتے ہو یہ کیا ہے۔"؟

میں نے کہا: "معلوم نہیں ۔ انجکشن سا لگتا ہے۔"

نرائن مسکرایا "انجکشن ہی ہیں۔ لیکن پنسلین کے۔"

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کیونکہ پنسلین اس وقت بہت ہی قلیل مقدار میں تیار ہوتی تھی۔ امریکہ اور انگلستان میں جتنی بنتی تھی تھوڑی تھوڑی کر کے ہسپتالوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ میں نے نرائن سے پوچھا

"یہ تو بالکل نایاب چیز ہے، تمہیں کیسے مل گئی؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بچپن میں گھر کی تجوری کھول کر روپے چرانا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا — آج دائیں ہاتھ سے ملٹری ہوسپٹل کا زنجیر ریفریجریٹر کھول کر میں نے یہ تین بلب چرائے ہیں۔۔۔۔ چلو جلدی کرو جانکی کو ہسپتال سے ہوٹل میں لے چلیں۔"

ٹیکسی لیکر میں ہسپتال گیا۔ اور جانکی کو اس ہوٹل میں لے گیا جس میں نرائن دو کمروں کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔

جانکی نے کئی بار مجھ سے نحیف آواز میں پوچھا کہ میں اسے ہوٹل میں کیوں لایا ہوں — ہر بار میں نے یہی جواب دیا۔ "تمہیں معلوم ہو جائے گا۔۔!"

اور جب اسے معلوم ہوا یعنی جب نرائن سرنج ہاتھ میں لئے اسے ٹیکہ لگانے کے لئے اس کمرے میں آیا۔ تو اس نے نفرت سے ایک طرف منہ پھیر لیا۔ اور مجھ سے کہا۔ "سعادت صاحب اس سے کہئے چلا جائے یہاں سے۔"

نرائن مسکرایا۔ "جان من غصہ تھوک دو — یہاں تمہاری جان کا سوال ہے۔"

جانکی کو طیش آگیا۔ نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "سعادت صاحب میں جاتی ہوں یہاں سے۔ یا آپ اس حرامزادے کو نکالئے باہر۔"

نرائن نے دھکا دے کر اسے لٹا دیا۔ اور مسکراتے ہوئے کہا "یہ حرامزادہ تمہیں انجکشن لگا کر ہی رہے گا — خبردار جو تم نے مزاحمت کی۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ جانکی کا بازو پکڑا۔ سرنج مجھے دے کر اس نے اسپرٹ میں روئی بھگوئی۔ اور اس کا بازو صاف کیا۔ اس کے بعد روئی مجھے دے کر اس نے سرنج کی سوئی اس کے بازو کی مچھلی میں داخل کر دی۔ وہ چیخی لیکن پنسلین اس کے جسم میں جا چکی تھی۔

جب نرائن نے جانکی کا بازو اپنی مضبوط گرفت سے علیحدہ کیا تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ نرائن نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور سپرٹ لگی روئی سے انجکشن والا حصہ پونچھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پہلا انجکشن رات کے نو بجے دیا تھا۔ دوسرا تین گھنٹے کے بعد دینا تھا۔ نرائن نے مجھے بتایا۔ اگر تین کے ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تو پنسلین کا اثر بالکل زائل ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ جاگتا رہا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے اسٹوو جلایا۔ سرنج ابالی اور اس میں دوا بھری۔

جانکی خرخراہٹ بھرے سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ نرائن نے دوسرے بازو کو سپرٹ سے صاف کیا۔ اور سرنج کی سوئی اندر کھبو دی۔ جانکی کے ہونٹوں سے پتلی سی چیخ نکلی۔ نرائن نے دوا جسم کے اندر بھیج کر سوئی باہر نکال لی۔ اور اسپرٹ سے انجکشن والی جگہ صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"اب تیسرا تین بجے۔"

مجھے معلوم نہیں اس نے تیسرا اور چوتھا انجکشن کب دیا۔ لیکن

بیدار ہوا تو اسٹوو جلنے کی آواز آرہی تھی۔ اور نرائن ہوٹل کے بیرے سے برف کے لئے کہہ رہا تھا۔ کیونکہ اسے پنسلین کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔

نو بجے پانچواں انجکشن دینے کے لئے جب ہم دونوں جانکی کے کمرے میں گئے تو وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے نرائن کی طرف دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ نرائن مسکرایا۔ "کیوں جان من کیا حال ہے۔۔"؟

جانکی خاموش رہی۔

نرائن اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔" یہ انجکشن جو میں تمہیں دے رہا ہوں عشق کے انجکشن نہیں۔ تمہارا نمونیہ دور کرنے کے انجکشن ہیں۔ جو میں نے ملٹری ہوسپٹل سے بڑی صفائی کے ساتھ چرائے ہیں ۔۔ لو اب ذرا الٹی لیٹ جاؤ۔ اور کولھے پر سے شلوار کو ذرا نیچے کھسکا دو ۔ کبھی لیا ہے یہاں انجکشن۔ "؟

یہ کہہ کر جانکی کے کولھے پر ایک جگہ گوشت کے اندر انگلی چبھوئی اس کی آنکھوں میں مرعوب سی نفرت پیدا ہوئی۔

جب اس نے کروٹ بدلی تو نرائن نے کہا: "شاباش۔"

پیشتر اس کے کہ جانکی کوئی مزاحمت کرے نرائن نے ایک ہاتھ سے شلوار نیچے کی طرف کھسکائی اور مجھ سے کہا: "اسپرٹ لگاؤ۔"

جانکی نے ٹانگیں چلانا شروع کیں تو نرائن نے کہا۔ جانکی ٹانگیں وانگیں مت چلاؤ ۔۔ میں انجکشن لگا کے رہوں گا۔"

غرضیکہ پانچواں انجکشن دے دیا گیا۔ پندرہ اور باقی تھے جو

نرائن کو ہر تین گھنٹے کے بعد دینے تھے۔ اور یہ پنتالیس گھنٹے کا کام تھا۔ پانچ انجکشنوں سے گو جانکی کو بظاہر کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ لیکن نرائن کو پنسلین کے اعجاز کا یقین تھا۔ اور اسے پوری پوری امید تھی کہ وہ بچ جائے گی۔ ہم دونوں بہت دیر تک اس نئی دوا کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب نرائن کا نوکر میرے نام ایک تار لے کر آیا۔ پونہ سے تھا۔ ایک فلم کمپنی نے مجھے فوراً بلایا تھا۔ اس لئے مجھے جانا پڑا۔

دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی ہی کے کام سے میں بمبئی آیا۔ کام ختم کر کے جب میں اندھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہوٹل ہی میں ہے۔ ہوٹل بہت دور شہر میں تھا۔ اس لئے رات میں وہیں اندھیری میں رہا۔

صبح آٹھ بجے وہاں پہنچا تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو میری آنکھوں کے سامنے کچھ عجیب منظر تھا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس گئی۔ اور نرائن نے جو اس کے ساتھ لیٹا تھا۔ مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا "آؤ منٹو.......... میں ہمیشہ دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں ــــ آؤ یار آؤ۔ بیٹھو اس کرسی پر ــــ لیکن یہ جانکی کی شلوار دے دینا۔"

٭٭٭٭٭٭

موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ـــــــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اور وہ کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان، بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز۔ بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نگاہ تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں اٹک گئے ہیں۔ اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی ـــــــ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ

وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا تھا۔ اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بےحد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا۔ جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ جیسے رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں تر و تازگی چوس کر خاموش ہنس رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اب وہ صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال اور اس کا خاندان ـــــ محلے میں تھا جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو چکا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔ غالباً اڑتالیس گھنٹے لگا ـــــ اور ترلوچن بہت مضطرب تھا۔ آس پاس سب مسلمان تھے بڑے خوفناک قسم کے مسلمان، اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ، مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ـــــ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لیجا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا۔ کہ اسے وہاں اپنے تازہ لئے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ

بحال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصّہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا۔ فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا "نرنجن! یہ ٹھیکے دیکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں تمہارا گھر پر رہنا بہت ضروری ہے۔ اول تو یہاں سے اٹھ جاؤ۔ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیا کرتا ہے" مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا "یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ــــ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں بمبئی ہے ــــ بمبئی! تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ــــ بارہ برس سے"!

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس میں اگر فسادات برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے پاس کوئی چھو منتر ہے ــــ یا وہ کہانیوں کا ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ــــ محلہ قطعی محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ پڑھنے کے لئے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی

پروا نہ تھی ۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو تر لوچن کے لیے اچھا تھا ۔ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی ملا جاتا اور بھی اچھا تھا ۔ تاکہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا ۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستہ میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا چنانچہ جب بھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگر سنگھ کہتا ۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ۔۔۔ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا ۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکر رہے ۔ کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی ۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگر سنگھ کی بہن تھی ۔ مگر بہت ہی نرم و نازک اور لچکیلی تھی ۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی ۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں ۔ مگر اس میں وہ سختی وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی محنت کرنی پڑتی ہے ۔

اس کے نقشے پتلے تھے ۔ جیسے ابھی نامکمل ہیں ۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں ۔ جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنی تھیں ۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلہ میں اس کا رنگ گورا تھا ۔ مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے ۔ اور وہ بے حد شرمیلی تھی ۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا ۔ مگر وہ زیادہ دیر وہاں رہا نہیں

تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی سکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ سکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ۔۔۔ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا۔ شاید اس لئے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرس کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا۔ اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ، پھر بمبئی۔ جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بری نہیں تھی خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزارہا دیئے روشن تھے۔ اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کو سوچتے سوچتے، وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا۔ اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی

معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے بیحد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چھٹی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید جبہ پہنے تھی۔ جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی چھاتیاں تین چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بانہیں جو کہ ننگی تھیں ——— ہین ہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے۔ اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے۔ مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھیڑیے کے گوشت کے ٹکڑے سے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی بہت ہی تنگ۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی ——— ترلوچن اس کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی ——— ترلوچن لوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں چکنے سیمنٹ کے فرش پر پھسلی اور وہ اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر آ رہی۔ کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا جبہ اوپر چڑھ گیا تھا۔ اور اس کی دو ننگی ——— بڑی

بڑی ٹانگیں۔ اس کے اِدھر اُدھر تھیں اور..... جب ترلوچن نے اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موزیل ساری موزیل سے الجھا، جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موزیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور پھر مسکرا دی۔ یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے "اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کے ساتھ والی انگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موزیل سے دوستی کرنا شاید مشکل ہو لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھُل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ باہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھر کتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں۔ برما میں سنگاپور میں۔ وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت اکھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں "گوڈے گوڈے" دھنس جائے

گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر سج بج کر سنیما جانے کے لئے تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ملاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لئے پُر تکلف کھانے منگوائے ہیں۔ مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آگیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس بیٹھ گئی ہے۔ اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا، جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ فولاد کی طرح مضبوط ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی: "تم سکھ ہو۔ ___ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں"۔

ترلوچن جل بھن جاتا۔ اور پوچھتا: "کون سی نازک باتیں ___ تمہارے پرانے یاروں کی"؟

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی: "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو

—— ہاں وہ میرے یار ہیں —— اور مجھے اچھے لگتے ہیں ——
تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔"

نرلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھیگی؟

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی "تم سچ مچ سکھ ہو —— تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ —— اگر نبھانا چاہتے ہو تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کر لو —— میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہشمند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹایل لونڈوں کے سامنے جنکی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اسے ذلیل ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِّ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی —— پسند ہی نہیں، جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا لیکن ثابت قدم رہا
آخر ایک روز جبکہ موذیل موج میں تھی۔ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ
کر پوچھا: "موذیل کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر
اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی یہودی آنکھیں
اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا: "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی"

ترلوچن نے محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں
کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ
لگ گئی "موذیل۔ تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو --- یہ میرا مذاق
نہیں، میری محبت کا مذاق ہے"

موذیل اٹھی۔ اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو
ایک دل فریب جھٹکا دیا "تم شیو کرا لو! اور اپنے سر کے بال چھوڑ دو
تو میں شرط لگاتی ہوں۔ کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے
تم خوبصورت ہو"

ترلوچن کے کیسوں میں چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے
بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا۔ اور اس کے عنابی
ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیے۔

موذیل نے ایک دم "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے
علیحدہ ہو گئی "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں
تم تکلیف نہ کرو

ترلوچن چلایا "موذیل"

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی۔
لگی ہوئی کا ڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں "خدا کی قسم --- تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ــــــ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی۔
ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہوجاتا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آگئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کردی --- اس میں جو پنیں لگی تھیں وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبالیں۔
ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے ڈاڑھی مونچھ نہیں اُگی تھیں تو واقعی لوگ کھلے کیسوں کے ساتھ اس کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے خدوخال جھاڑیوں کی مانند اپنے اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے۔ جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔
جب ڈاڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"
دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی "تمہارے بال بہت ملائم ہیں ــــــ میرا انداز غلط تھا۔ کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف

ہو سکے گا ــــ تر لوچن ــــ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انھیں گوندھ کر اپنے لئے ایک فسٹ کلاس بٹوا بنواؤں گی!"

اب تر لوچن کی ڈاڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موزیل سے مخاطب ہوا "میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ــــ تم کیوں اڑاتی ہو ــــ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ــــ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لئے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ــــ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں"؟

موزیل نے تر لوچن کی ڈاڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔ "مجھے معلوم ہے"!

"پھر" تر لوچن نے اپنی ڈاڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہہ کئے اور موزیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ــــ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"مجھے معلوم ہے"۔ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ "میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی"۔

تر لوچن اچھل پڑا۔ "سچ"!

موزیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لئے چمکے۔ "ہاں"۔

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی ڈاڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے
کے ساتھ بھینچ لیا۔ تو..... تو کب؟"
موذیل الگ ہٹ گئی۔ "جب تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے"
ترلوچن اس وقت جو ہو سو ہو، بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا۔
اور کہہ دیا "میں کل ہی کٹوا دوں گا"
موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی "تم بکواس کرتے ہو ترلیچ
تم میں اتنی ہمت نہیں ہے"
اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال
کو باہر نکال پھینکا۔ "تم دیکھ لو گی"
"دیکھ لوں گی" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں
کو چوما۔ اور "پھوں پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔
ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا وہ کن کن اذیتوں
سے گذرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لئے کہ دوسرے روز اس
نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے۔ اور ڈاڑھی بھی منڈوا دی۔
یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا جب سارا
معاملہ صاف ہو گیا۔ تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل
آئینے میں دیکھتا رہا۔ جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر
کے لئے غور کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے۔
ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا جو سیلون
سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اور دیر تک اس کو چھیڑتی اور گدگداتی
رہی تھی۔ اس نے ٹیرس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا جہاں ٹینکوں

اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بغیر نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز صبح موذیل کو چٹ بھیجی۔ کہ اس کی طبیعت ناساز ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے آ جائے۔ موذیل آئی ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچ" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی۔ اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا۔ کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ موذیل نے نے جب اسے محسوس کیا۔ تو اپنے سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا۔ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔"

موذیل پہ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا کہا۔ "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ایسے ہی چلتا ہے۔"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے۔ اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر

اس نے موذیل کو اپنے سینے سے لگالیا "شادی کل ہوگی۔"
"ضرور!" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونہ میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی اس لئے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا۔ کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل فورٹ کے ایک سٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا ______ ترلوچن مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے۔ دیولالی گئی۔۔ اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہاں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گذری ؟ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا۔ اور موذیل کو بھول گیا۔ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہوگئی۔ اور وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا۔ کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پر لگے ہوئے تھے۔ اور جو چڑوں کی مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا

اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ موزیل سے
شادی کی غلطی نہ کر بیٹھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موزیل کی یاد ایک چٹکی کی مانند اس
کے دل کو پکڑ لیتی تھی۔ اور پھر چھوڑ کر رگڑتے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ۔
وہ بے حیا تھی بے مروت تھی اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا
پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی اسی لئے وہ کبھی کبھی اس کے متعلق
سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے
اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کار خریدی تھی۔ یا اسے
چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے ——— اس کو اس خیال سے
سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس
کو موزیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں خرچ کر چکا تھا۔ لیکن اپنی مرضی
سے ورنہ موزیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند
آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ
کیا جو اسے بہت پسند تھے۔ مگر اسی دکان میں موزیل جھوٹے، بھڑکیلے
اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن
سے منتیں کرنے لگی کہ وہ اسے وہی خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا تھا کہ موزیل کس قماش کی لڑکی ہے
کس آب و گل سے بنی ہے وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی اس کو
چومنے کی اجازت دے دیتی تھی وہ صابن کا سارا صابن کی مانند اس
کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہ

دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی تم سکھ ہو مجھے تم سے نفرت ہے۔"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس اس کی صحبت میں نہ گزارتی دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی۔ "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ـــــ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیا کرو ـــــ تم مجھے یہ بتاؤ کونسا لباس ہے جس میں آدمی دکھائی نہیں دیتا... یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں ـــــ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ـــــ تم سکھ ہو ـــــ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکرے سے ملتا جلتا ہے ـــــ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے ـــــ شرم آنی چاہئے تمہیں ـــــ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے۔"

ترلوچن کو شروع شروع میں یہ باتیں سن کر غصہ آتا تھا مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا۔ اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں۔ اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا

تھا کہ نہ بیکار اتنے دنوں بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔

پانی کی ٹنکی کے پاس پہونچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کردیا ——— کرپال کور ایک پاکیزہ لڑکی جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلے میں تھی۔ جس میں کٹر قسم کے مسلمان۔ بستے تھے اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں ——— لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہاں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پرواہ کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں، اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا ——— اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا فورٹ میں ایک باربر تھا۔ وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ تراشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری۔ اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے ———؟ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں۔ جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ——— آواز قریب آتی گئی۔ ایک دم اس نے دوسری

ٹنکی کے پاس موزدیل کو دیکھا جو یہودیوں کی خاص وضع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ــــ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا کہ اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا ــــ اس نے سوچا: "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ــــــ اور اس وقت بیرس پر کیا کرنے آئی ہے۔"

موزیل نے انگڑائی لی ــــــــ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ــ ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔

وہ زور سے کھانسا۔ موزیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا رد عمل بالکل خفیف تھا کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی: "تم پھر سکھ بن گئے ہو ترلوچن؟"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موزیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیوی بلو سکرٹ صاف کر سکے ــــــــ مگر وہ تو وہیں دیوالی میں رہ گئی ہے"

ترلوچن خاموش رہا۔

موزیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی "بولتے کیوں نہیں سردار

صاحب؟"

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ——— کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا "بیمار رہی ہو؟"

"نہیں" موذیل نے اپنے تراشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں" موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی۔ اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی ——— "تم گویا کہ اب پھر نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو؟"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "ہاں"۔

"مبارک ہو"۔ موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی"۔ کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کر دی کیا؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں"۔

"مبارک ہو ——— اس بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

نہیں"

"یہ بہت بری بات ہے" موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔ "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

ترلوچن خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا — "کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں"

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے نہیں کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موزیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے۔ ایک بڑی بوٹی کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی "تم اب یہ داڑھی منڈوا لو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا — موزیل اس کے مقابلہ میں فاحشہ ہے بدصورت ہے، بے وفا ہے بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا اس نے موزیل سے صرف اتنا کہا"۔

"موزیل! میں شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادھی لڑکی ہے — جو مذہب کی پابند ہے اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی۔ لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا، "اگر وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ — کیا اسے معلوم نہیں کہ ایک دفعہ تم بال کٹوا چکے ہو"؟

"اس کو ابھی تک معلوم نہیں۔ داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی محض انتقامی طور پر۔ اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی مگر — میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے پہچان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں۔

مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے"۔ ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنی شروع کر دی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی"۔ یہ بہت اچھا ہے ..... مگر یہ کمبخت مچھر یہاں بھی موجود ہیں ..... دیکھو کس زور سے کاٹا ہے؟

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا۔ انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"کب ہو رہی ہے تمہاری شادی"؟

"ابھی کچھ پتہ نہیں" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا"

ترلوچن۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی "تم ول درجے کے ایڈیٹ ہو جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے

مشکل! موذیل تم اس معاملے کی نزاکت کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔ کسی بھی معاملے کی نزاکت ــــ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری

"افسوس بی ڈیمڈ سلی ایڈیٹ ــــ تم یہ سوچو کہ تمہاری اس.... کیا نام ہے اس کا..... اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے .... تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے... تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے .... تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو .... اور بہت ڈرپوک مجھے نڈر مرد چاہیئے .... لیکن چھوڑو ان باتوں کو.... چلو آؤ، تمہاری اس کور کو لے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا ــــ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا۔ "کہاں سے؟

وہیں سے جہاں وہ ہے ــــ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ جانتی ہوں چلو آؤ میرے ساتھ "

"مگر سنو تو ــ کرفیو ہے۔"

"موذیل کے لئے نہیں ــ چلو آؤ۔"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی۔ جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رک گئی اور ترلوچن کی طرف دیکھنے لگی

ترلوچن نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا۔ یہ تمہاری داڑھی ــــ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں۔ کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو"۔

"ننگے سر" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا میں ننگے سر نہیں جاؤں گا"۔

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں؟

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی" تم سمجھتی نہیں ہو میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں"۔

کیوں ٹھیک نہیں؟

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ــــ وہ سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں ــــ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا"۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری" تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو ــــ گدھے کہیں کے ــــ اس کی جان کا سوال ہے ــــ کیا نام ہے تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو"؟

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی"۔ موذیل وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت

کرنے لگے گی"

موذیل چڑ گئی "اوہ تمہاری محبت بی ڈیمیڈ ۔۔۔ میں پوچھتی ہوں کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں ۔۔۔ اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے ۔۔۔ اور شاید اپنا انڈرویر بھی"۔

ترلوچن نے کہا "وہ تو میں ہر وقت پہنتا ہوں"۔

"بہت اچھا کرتے ہو ۔۔۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلہ کا ہے جہاں میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ۔۔۔۔۔ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے"۔

ترلوچن نے مختصر سا جواب "مجھے اس کی پرواہ نہیں ۔۔۔ اگر میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا

موذیل جھنجلا گئی۔ اس زور سے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں "گدھے تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی جب تم نہ رہو گے"۔

تمہاری وہ ۔۔۔ کیا نام ہے اس بھڑوی کا ۔۔۔ جب وہ بھی نہ رہے گی ۔۔۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا ۔۔۔ تم سکھ ہو ۔۔۔ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو"۔

ترلوچن بھنا گیا۔ "بکواس نہ کرو"۔

موذیل زور سے ہنسی مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی

کرنے لگے گی"

موذیل چڑگئی: "اور تمہاری محبت ابی ڈیملیڈ — میں پوچھتی ہوں کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں — اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے — اور شاید اپنا انڈر رویر بھی"۔

ترلوچن نے کہا: "وہ تو میں ہر وقت پہنتا ہوں"۔

"بہت اچھا کرتے ہو — مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلہ کا ہے جہاں میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ——— تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے"۔

ترلوچن نے مختصر سا جواب: "مجھے اس کی پرواہ نہیں — اگر میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا

موذیل جھنجلا گئی۔ اس زور سے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی جب تم نہ رہو گے"۔

تمہاری وہ — کیا نام ہے اس بھڑوی کا — جب وہ بھی نہ رہے گی — اس کا خاندان تک نہ رہے گا — تم سکھ ہو — خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو"۔

ترلوچن بھنا گیا۔ "بکواس نہ کرو"۔

موذیل زور سے ہنسی مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی

ہوئی یا نہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول دے کر کہا ”ڈارلنگ چلو جیسی تمہاری مرضی —— جاؤ پگڑی پہن کر آؤ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں“

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا ”تم کپڑے نہیں پہنو گی؟“

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا ”نہیں —— چلے گا اسی طرح“

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سن رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کئے، پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا۔ اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگریٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے قریب پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصہ میں کہا —————— ”تم بہت ذلیل ہو“

موذیل مسکرائی ”یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی —— اس سے پہلے اور کئی لوگ مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں“۔ پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ ”یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے کیس ہیں۔“

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بہت دھیرے دھیرے جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگران کی روشنی بیمار معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹرامیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں۔ اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی ـــــ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سڑک پر کوئی انسان گذرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموشی فضا میں بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ کر دو منٹ وہ اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوف زدہ تھا۔ کوئی پتہ کھڑکتا تھا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی۔ جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہو۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گونجی ـــــ "اے کدھر جا رہا ہے؟"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس

سنج گئی۔ اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔" اوہ تم ——
ہم کو پہچانا نہیں تم نے —— موذیل ....." پھر اس نے ایک گلی کی
طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ادھر اس باجو —— ہمارا بہن رہتا ہے
اس کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے۔"

سپاہی اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا
معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیہ نکالی۔ اور ایک سگرٹ نکال کر اس
کو دیا "لو پیو۔"

سپاہی نے سگریٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگایا ہوا
سگریٹ نکالا اور اس سے کہا۔" ہیئر از لائٹ۔"

سپاہی نے سگریٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور
بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی جس
میں سے گزر کر انھیں محلے میں جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی
کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی تھی خطروں
سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ
جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی سمندر کی پیل تن
لہروں سے ٹکراتی بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی۔ اور اس
کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں ڈوب نہ جائے جب
وہ واپس آتی تھی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا۔
مگر اسے ان کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے ڈر ڈر کے

ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار کر فرار نہ ہو جائے۔ موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا: "ترلوچ ڈیر ——— اس طرح سے ڈرنا اچھا نہیں ——— تم ڈرو گے تو کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا سچ کہتی ہوں" یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔

ترلوچن خاموش رہا

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی ——— کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی ایک لحظے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا: "کوئی بات نہیں ——— چلے آؤ"

دونوں چلنے لگے۔ ایک آدمی سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آرہا تھا ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا ——— کہ موذیل آ گئی ——— لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجہ میں کہا "اے کیا کرتا ہے ——— اپنے بھائی کو مارتا ہے ——— ہم اس سے شادی کرنے کو مانگتا ہے" پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی "کریم! ——— اٹھاؤ یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر"

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں

نے موذیل کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا "عیش کر سالی، عیش کر"۔ پھر اس نے برات اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا "کیسی ذلیل حرکت کی ہے۔ حرامزادے نے"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا "کوئی ذلیل حرکت نہیں — سب چلتا ہے ...... آؤ"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دئے یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلہ میں پہونچ گئے جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی۔ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا۔ اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے فٹ پاتھ پر انھوں ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ۔ ٹھٹک گئی۔

اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا "ترلوچ ڈیر ـــ یہ پگڑی اتار دو"

ترلوچن نے جواب دیا"

میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا"

موزیل جھنجلا گئی "— تمہاری مرضی — لیکن تم دیکھتے نہیں سامنے کیا ہو رہا ہے"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑے پراسرار قسم کی —— دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موزیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی —— موزیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ کچھ سوچ رہی تھی —— جب یہ دونوں آدمی گلی کے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا "دیکھو ایسا کرو میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں —— تم میرے پیچھے آنا بڑی تیزی سے جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو —— سمجھے —— مگر یہ سب ایکدم جلدی جلدی میں ہو۔"

موزیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے۔

سیڑھیوں کے پاس ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موزیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اس نے ترلوچن سے پوچھا "کون سا مالا؟"

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "دوسرا" "چلو"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔

ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی۔ اور پھر دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی: "مہنگا سنگھ جی۔ مہنگا سنگھ جی"

اندر سے مہین سی آواز آئی۔ "کون؟"

"ترلوچن"

دروازہ دھیرے سے کھلا —— ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہو گئے —— موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا۔ جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لئے غور سے دیکھا۔ پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی۔ مگر زکام میں مبتلا موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینہ کے ساتھ لگا لیا۔ اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کیساتھ کہا۔ "ڈرو نہیں۔ ترلوچن تمھیں لینے آیا ہے"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل کے جسم سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا: "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں۔ اور اپنی ماتا جی سے بھی —— لیکن جلدی کرو"

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی چیخ رہا ہے۔ اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی" اسے پکڑ لیا انھوں نے"

ترلوچن نے پوچھا" کسے ؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ "مو پکڑ لیا تو اچھا ہوا۔ تم یہ کپڑے اتار دو"۔

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیض اتار کر ایک طرف رکھ دی کرپال کور نے اپنی باہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا۔ اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے ڈھیلا ڈھیلا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا۔ اور اس کی شلوار اتار کر ترلوچن سے کہنے لگی "جاؤ، اسے لے جاؤ لیکن ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے۔ اور اس سے کہا۔

"جاؤ۔ جلدی سے نکل جاؤ"۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔

"آؤ۔ مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیئے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی باہوں پر مہین مہین سردی کے باعث دانے ابھرے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔ ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"

"جہنم میں جائیں وہ ——— تم اسے لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں آجاؤں گی۔"

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے دروازے کے پاس آکر انھوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا:۔

"سنو! اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں ......"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی دب گئی: "دروازہ۔"

موذیل ترلوچن سے مخاطب ہوئی: "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں ——— تم میرے پیچھے بھاگنا ——— میں اوپر چڑھ جاؤں گی۔ تم بھی اوپر چلے آنا ——— یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں۔ سب کچھ بھول جائیں گے۔ اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔"

ترلوچن نے پوچھا: "پھر؟"

موذیل نے کہا "یہ تمھاری ـــــ کیا نام ہے اس کا موقعہ پاکر نکل جائے۔ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا۔ اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری سب بوکھلا گئے۔ اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رُخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔

وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا۔ اوپر کے زینہ سے وہ کچھ اس طرح ڈھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آرہی۔ پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے آئے تھے۔ ارد گرد جمع ہوگئے۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑ رہی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا۔ اور آواز دی "موذیل۔ موذیل!"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں۔ جو لال بہوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی۔ اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا:۔

"جاؤ دیکھو میرا انڈرویر وہاں ہے کہ نہیں ـــــ میرا مطلب ہے وہ ......"

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا۔ مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصّے سے کہا۔ تم سچ مچ سکھ ہو ...... جاؤ دیکھ کر آؤ۔"

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔"یہ میاں بھائی ہے ...... لیکن بہت دادا قسم کا... میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔"

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے ...... موذیل نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا۔ 'اوہ ڈیم اٹ'' یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔" آل رائٹ ڈارلنگ۔ بائی بائی۔"

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔"لے جاؤ اس کو اس کو ـــــ اپنے اس مذہب کو۔" اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر سے بے حس ہو کر گر پڑا۔

محمودہ

مستقیم نے محمودہ کو پہلی مرتبہ اپنی شادی پر دیکھا۔ آرسی مصحف کی رسم ادا ہورہی تھی کہ اچانک اس کو دو بڑی بڑی۔ غیر معمولی طور پر بڑی آنکھیں دکھائی دیں۔ یہ محمودہ کی آنکھیں تھیں جو ابھی تک کنواری تھیں مستقیم عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا تھا۔ محمودہ کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اسے قطعاً محسوس نہ ہوا کہ آرسی مصحف کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ اس کی دلہن کیسی تھی۔ یہ بتانے کے لئے اس کو موقعہ دیا گیا تھا مگر محمودہ کی آنکھیں، اس کی دلہن اور اس کے درمیان ایک سیاہ غمگین پردے کی مانند حائل ہوگئیں۔

اس نے چوری چوری کئی مرتبہ محمودہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں سب چہچہا رہی تھیں۔ مستقیم سے بڑے زوروں پر چھیڑ خانی ہورہی تھی۔ مگر وہ الگ تھلگ کھڑکی کے پاس گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے خاموش بیٹھی تھی۔

اس کا رنگ گورا تھا۔ بال تختیوں پر لکھنے والی سیاہی کی مانند کالے اور چمکیلے تھے۔ اس نے سیدھی مانگ نکال رکھی تھی۔ جو اس کے بیضوی چہرے پر بہت سجتی تھی۔ مستقیم کا اندازہ تھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے۔ چنانچہ جب وہ اٹھی تو اس کی تصدیق ہوگئی۔

لباس بہت معمولی قسم کا تھا۔ ڈوپٹہ جب اس کے سر سے ڈھلکا اور فرش تک جا پہنچا تو مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا بھرا بھرا

جسم، تیکھی ناک، چوڑی پیشانی، چھوٹا سا دہانہ اور آنکھیں جو دیکھنے والے کو سب سے پہلے دکھائی دیتی تھیں۔

مستقیم اپنی دلہن گھر لے آیا۔ دو تین مہینے گزر گئے۔ وہ خوش تھا۔ اس لئے کہ اس کی بیوی خوبصورت اور باسلیقہ تھی۔ لیکن وہ محمودہ کی آنکھیں نہیں بھول سکا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ اس کے دل و دماغ پر مرتسم ہوگئی ہیں۔

مستقیم کو محمودہ کا نام نہیں معلوم تھا۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی کلثوم سے برسبیل تذکرہ پوچھا۔ "وہ لڑکی کون تھی ہماری شادی پر۔ جب آرسی مصحف کی رسم ادا ہورہی تھی۔ وہ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔"

کلثوم نے جواب دیا۔ "میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اس وقت کئی لڑکیاں تھیں معلوم نہیں آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔"

مستقیم نے کہا۔ "وہ ——— وہ جس کی یہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔"

کلثوم سمجھ گئی۔ "وہ آپ کا مطلب محمودہ سے ہے ——— ہاں واقعی اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں۔ لیکن بری نہیں لگتیں ——— غریب گھرانے کی لڑکی ہے بہت کم گو اور شریف۔ کل ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔"

مستقیم کو غیرارادی طور پر ایک دھچکا سا لگا۔ "اس کی شادی ہوگئی کل؟"

"ہاں میں کل وہیں تو گئی تھی میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ میں نے اس کو ایک انگوٹھی دی ہے۔"

ہاں ہاں۔ مجھے یاد آگیا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم جس سہیلی کی شادی پر جارہی ہو، وہی لڑکی ہے بڑی بڑی آنکھوں والی۔ کہاں شادی ہوئی ہے اس کی؟"

کلثوم نے گلوری بنا کر اپنے خاوند کو دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے عزیزوں میں

اس کا شوہر ریلوے ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ ہے سنا ہے بے حد شریف آدمی ہے۔"

مستقیم نے گلوری کلّے کے نیچے دبائی۔" چلو اچھا ہو گیا۔ لڑکی بھی جیسا کہ تم کہتی ہو۔ بہت شریف ہے۔"

کلثوم سے رہ نہ گیا۔ اسے تعجب تھا کہ اس کا خاوند محمودہ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔"حیرت ہے کہ آپ نے اس کو محض ایک نظر دیکھنے پر بھی یاد رکھا۔"

مستقیم نے کہا:"اس کی آنکھیں کچھ ایسی ہیں کہ آدمی انھیں بھول نہیں سکتا کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔"

کلثوم دوسرا پان بنا رہی تھی۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ اپنے خاوند سے مخاطب ہوئی۔"میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ مرد جانے کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔"

مستقیم نے مناسب خیال کیا کہ اس موضوع پر اب مزید گفتگو ہونی نہیں چاہیئے۔ چنانچہ جواب میں مسکرا کر وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اتوار کی چھٹی تھی۔ حسب معمول اسے اپنی بیوی کے ساتھ میٹنی شو جانا چاہیئے تھا۔ مگر محمودہ کا ذکر چھیڑ کر اس نے اپنی طبیعت مکدر کر لی تھی۔

اس نے آرام کرسی میں لیٹ کر تپائی سے ایک کتاب اٹھائی جسے وہ دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ پہلا ورق نکالا اور پڑھنے لگا۔ مگر حروف گڈمڈ ہو کر محمودہ کی آنکھیں بن جاتے۔ مستقیم نے سوچا۔ شاید کلثوم ٹھیک کہتی تھی کہ اسے محمودہ کی آنکھوں میں کوئی کشش نظر نہ آئی۔ ہو سکتا ہے کسی اور مرد کو بھی نظر نہ آئے ایک صرف میں ہوں جسے دکھائی دی ہے۔ پر کیوں؟ میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ میرے لئے پرکشش بن جائیں۔ ایک لمحے کی تو بات تھی۔ بس میں نے ایک نظر دیکھا۔ اور وہ میرے دل و دماغ پر

چھاگئی - اس میں نہ اس کی آنکھوں کا قصور ہے اور نہ میری آنکھوں کا جن سے میں نے انھیں دیکھا۔" اس کے بعد مستقیم نے محمودہ کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ تو ہو گئی اس کی شادی۔ چلو اچھا ہوا۔ لیکن دوست یہ کیا بات ہے کہ تمھارے دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے۔ کیا تم چاہتے تھے کہ اس کی شادی نہ ہو۔ سدا کنواری رہے۔ کیوں کہ تمھارے دل میں اس سے شادی کرنے کی خواہش تو کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ تم نے اس کے متعلق کبھی ایک لحظ بھی نہیں سوچا۔ پھر جلن کیسی؟ اتنی دیر تمھیں اسے دیکھنے کا کبھی خیال نہ آیا۔ پر اب تم کیوں اسے دیکھنا چاہتے ہو۔ بہ فرض محال دیکھ بھی لو تو کیا کرو گے۔ اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لو گے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں نوچ کر اپنے بٹوے میں ڈال لو گے۔ بولو نا، کیا کرو گے؟"

مستقیم کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ اصل میں اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر کچھ چاہتا بھی ہے تو کیوں چاہتا ہے؟"

محمودہ کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ بھی صرف ایک روز پہلے یعنی اس وقت سے ایک روز پہلے جب مستقیم کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا محمودہ یقیناً دلہنوں کے لباس میں یا تو اپنے میکے یا اپنی سسرال میں شرمائی لجائی بیٹھی ہوگی وہ خود شریف تھی۔ اس کا شوہر بھی شریف تھا۔ ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا۔ اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ بڑی خوشی کی بات تھی۔ مستقیم کی دلی خواہش تھی کہ وہ خوش رہے۔ ساری عمر خوش رہے۔ لیکن اس کے دل میں جانے کیوں اک ٹیس سی اٹھتی تھی اور اسے بے قرار بنا جاتی تھی۔

مستقیم آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ سب بکواس ہے۔ اسے محمودہ کے متعلق قطعاً سوچنا نہیں چاہیئے۔ دو برس گذر گئے۔ اس دوران میں اسے محمودہ کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا، اور نہ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ حالاں کہ وہ اور اس کا خاوند کاپی میں ڈونگری کی ایک گلی میں رہتے تھے۔ مستقیم ڈونگری سے بہت

دور باہم میں رہتا تھا۔ لیکن اگر وہ چاہتا تھا تو بڑی آسانی سے محمودہ کو دیکھ سکتا تھا۔ ایک دن کلثوم ہی نے اس سے کہا: "آپکی اس بڑی بڑی آنکھوں والی محمودہ کے نصیب بہت برے نکلے۔

چونک کر مستقیم نے تشویشناک لہجہ میں پوچھا: "کیوں؟ کیا ہوا؟"

کلثوم نے گلوری بناتے ہوئے کہا۔ "اس کا خاوند ایک دم مولوی ہو گیا ہے!"

"تو اس سے کیا ہوا؟"

"آپ سن تو لیجئے۔ ہر وقت مذہب کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ لیکن بڑی اوٹ پٹانگ قسم کی۔ وظیفے کرتا ہے۔ چلے کاٹتا ہے۔ اور محمودہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ فقیروں کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ گھر بار سے بالکل غافل ہو گیا ہے۔ داڑھی بڑھائی ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی ہے۔ کام پر بھی جاتا ہے کبھی نہیں جاتا۔ کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔ وہ بے چاری کڑھتی رہتی ہے گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا نہیں اس لئے فاقے کرتی ہے۔ جب اس سے شکایت کرتی ہے تو آگے سے یہ جواب ملتا ہے۔ فاقہ کشی اللہ تعالےٰ کو بہت پیاری ہے!"

کلثوم نے یہ سب کچھ ایک سانس میں کہا:۔

مستقیم نے پندنیا سے تھوڑی چھالیا اٹھا کر منہ میں ڈالی: "کہیں دماغ تو نہیں چل گیا اس کا؟"

کلثوم نے کہا: "محمودہ کا تو یہی خیال ہے۔ خیال کیا اس کو یقین ہے گلے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالے پھرتا ہے۔ کبھی کبھی سبز رنگ کا چولا بھی پہنتا ہے۔"

مستقیم گلوری لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور آرام کرسی میں لیٹ کر سوچنے لگا: "یہ کیا ہوا۔ ایسا شوہر تو وبال جان ہوتا ہے۔ غریب کس مصیبت میں پھنس گئی ہے میرا خیال ہے پاگل پن کے جراثیم اس کے شوہر میں شروع ہی سے

موجود ہوں گے ۔ جواب ایک دم ظاہر ہوئے ہیں ۔ لیکن سوال ہے اب محمودہ کیا کرے گی ۔ اس کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں ۔ کچھ شادی کرنے والے لاہور سے آئے تھے اور واپس چلے گئے ۔ کیا محمودہ نے اپنے والدین کو لکھا ہوگا؟ ۔ نہیں نہیں اس کے ماں باپ تو جیسا کہ کلثوم نے کہا تھا ۔ اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے شادی اس کے چچا نے کی تھی ۔ ڈونگری ۔ ڈونگری میں شاید اس کی جان پہچان کا کوئی ہو ۔ نہیں ، جان پہچان کا کوئی ہوتا وہ فاقے کیوں کرتی ۔ کلثوم کیوں نہ اسے اپنے یہاں لے آئے ۔ پاگل ہوئے ہو مستقیم ۔ ہوش کے ناخن لو ۔"

مستقیم نے ایک بار پھر ارادہ کر لیا کہ وہ محمودہ کے متعلق نہیں سوچے گا ۔ اس لئے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا ۔ بے کار کی مغز پاشی تھی ۔

بہت دنوں کے بعد کلثوم نے ایک روز اسے بتایا کہ محمودہ کا شوہر جس کا نام جمیل تھا ۔ قریب قریب پاگل ہو گیا ہے "۔

مستقیم نے پوچھا "کیا مطلب ؟"

کلثوم نے جواب دیا ۔" مطلب یہ کہ اب وہ رات کو ایک سکنڈ کے لئے نہیں سوتا ۔ جہاں کھڑا ہے ۔ بس وہیں گھنٹوں خاموش کھڑا رہتا ہے ۔ محمودہ غریب روتی رہتی ہے ۔ میں کل اس کے پاس گئی تھی ۔ بیچاری کو کئی دنوں کا فاقہ تھا ۔ میں بیس روپے دے آئی کیوں کہ میرے پاس اتنے ہی تھے ۔"

مستقیم نے کہا ۔" بہت اچھا کیا تم نے ۔ جب تک اس کا خاوند ٹھیک نہیں ہوتا ۔ کچھ نہ کچھ دے آیا کرو ۔ تاکہ غریب کو فاقوں کی نوبت تو نہ آئے ۔"

کلثوم نے تھوڑے توقف کے بعد عجیب و غریب لہجے میں کہا ۔

"اصل بات کچھ اور ہے ۔"

"کیا مطلب ؟"

محمودہ کا خیال ہے کہ جمیل نے محض ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے ۔ وہ پاگل
واگل ہرگز نہیں ۔ بات یہ ہے کہ وہ ...."

"وہ کیا ؟"

"وہ عورت کے قابل نہیں .... یہ نقص دور کرنے کے لئے وہ حکیموں
اور سنیاسیوں سے ٹونے ٹوٹکا لیتا رہتا ہے ۔"

مستقیم نے کہا " یہ بات تو پاگل ہونے سے بھی زیادہ افسوس ناک
ہے ۔ محمودہ کے لئے تو یہ کھوکھ ازدواجی زندگی ایک خلا بن کے رہ گئی ہے ۔"

مستقیم اپنے کمرے میں چلا گیا ۔ اور بیٹھ کر محمودہ کی حالت زار کے متعلق
سوچنے لگا " ایسی عورت کی زندگی کیا ہو گی جس کا شوہر بالکل صفر ہو ۔ کتنے ارمان
ہوں گے اس کے سینے میں ۔ اس کی جوانی نے کتنے کپکپا دینے والے خواب دیکھے
ہوں گے ۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے کیا کچھ نہیں سنا ہو گا ۔ کتنی ناامید ہوئی ہو گی
غریب ، جب اسے چاروں طرف خلا ہی خلا نظر آیا ہو گا ۔ اس نے اپنے گود ہری
ہونے کے متعلق بھی کئی بار سوچا ہو گا ۔ جب ڈونگری میں کسی کے ہاں بچہ پیدا
ہونے کی اطلاع ملتی ہو گی تو بے چاری کے دل پر ایک گھونسا سا لگتا ہو گا ۔ اب
کیا کرے گی ۔ ایسا نہ ہو کر خودکشی کر لے ۔ دو برس تک اس نے کسی کو یہ راز نہ بتایا
مگر اس کا سینہ پھٹ پڑا ۔ خدا اس کے حال پر رحم کرے ۔"

بہت دن گذر گئے ، مستقیم اور کلثوم پنچ گنی چلے گئے ۔ وہاں ڈھائی مہینے رہے
واپس آئے تو ایک مہینے کے بعد کلثوم کے لڑکا ہوا ۔ وہ محمودہ کے ہاں نہ جا سکی ۔ لیکن
ایک دن اس کی ایک سہیلی جو محمودہ کو جانتی تھی اس کو مبارکباد دینے کے لئے آئی ۔
اس نے باتوں باتوں میں کلثوم سے کہا :۔

"کچھ سنا تم نے ۔ وہ محمودہ ہے نا ۔ بڑی بڑی آنکھوں والی ۔"

کلثوم نے کہا: "ہاں ہاں - ڈونگری میں رہتی ہے۔"

"خاوند کی بے پرواہی نے غریب کو بری باتوں پر مجبور کر دیا ہے۔" کلثوم کی سہیلی کی آواز میں درد تھا۔

کلثوم نے بڑے دکھ سے پوچھا "کیسی بری باتیں؟"

"اب اس کے ہاں غیر مردوں کا آنا جانا ہو گیا ہے۔"

"جھوٹ۔" کلثوم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"کلثوم" سہیلی نے کہا۔ "نہیں کلثوم۔ میں جھوٹ نہیں کہتی۔ پرسوں اس سے ملنے گئی تھی۔ دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے ایک نوجوان مرد جو میمن معلوم ہوتا تھا۔ باہر نکلا۔ اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اب اس سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی۔"

"یہ تم نے بہت بری خبر سنائی۔ خدا اس کو گناہ کے راستہ سے بچائے رکھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میمن اس کے خاوند کا کوئی دوست ہو۔" کلثوم نے خود کو فریب دیتے ہوئے کہا۔

اس کی سہیلی مسکرائی۔ "دوست چوروں کی طرح دروازہ کھول کر بھاگا نہیں کرتے۔" کلثوم نے اپنے خاوند سے بات کی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ کبھی نہیں روتا تھا۔ پر جب کلثوم نے اسے یہ اندوہناک بات بتائی کہ محمودہ نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ محمودہ ان کے یہاں رہے گی۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا: "یہ بڑی خوفناک بات ہے۔ تم ایسا کرو۔ ابھی جاؤ اور محمودہ کو یہاں لے آؤ۔" کلثوم نے بڑے روکھے پن سے کہا: "میں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔"

"کیوں؟" مستقیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس میری مرضی میرے گھر میں کیوں رہے ۔۔۔ اس لئے کہ آپ کو اس کی آنکھیں پسند ہیں۔" کلثوم کے بولنے کا انداز بہت زہریلا اور طنزیہ تھا۔

مستقیم کو بہت غصہ آیا۔ مگر پی گیا۔ کلثوم سے بحث کرنا بالکل فضول تھا ایک صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کلثوم کو نکال کر محمودہ کو لے آئے ۔۔۔ مگر وہ ایسے اقدام سے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مستقیم کی نیت قطعاً نیک تھی۔ اس کو خود کا احساس تھا دراصل اس نے کسی گندے زاویہ نگاہ سے محمودہ کو دیکھا ہی نہیں ۔۔۔ البتہ اس آنکھیں اس کو واقعی پسند تھیں۔ اتنی کہ وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔

وہ گناہ کا راستہ اختیار کر چکی تھی۔ ابھی اس نے صرف چند قدم اٹھائے تھے۔ اس کو تباہی کے غار سے بچایا جا سکتا تھا ۔۔۔ مستقیم نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ کبھی روزہ نہیں رکھا تھا۔ کبھی خیرات نہیں دی تھی ۔۔۔ خدا نے اس کو کتنا اچھا موقعہ دیا تھا۔ کہ وہ محمودہ کو گناہ کے راستے پر سے گھسیٹ کر لے آئے اور طلاق وغیرہ دلوا کر اس کی کسی اور سے شادی کرا دے۔ مگر وہ یہ ثواب کا کام نہیں کر سکتا تھا اس لئے کہ وہ بیوی کا محکوم تھا۔

بہت دیر تک مستقیم کا ضمیر اس کو سرزنش کرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کوشش کی کہ اس کی بیوی رضامند ہو جائے۔ مگر جیسا کہ مستقیم کو معلوم تھا ایسی کوشش لاحاصل تھی۔

مستقیم کا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو کلثوم ضرور محمودہ سے ملنے جائے گی، مگر اس کو ناامیدی ہوئی۔ کلثوم نے اس روز کے بعد محمودہ کا نام تک نہ لیا۔

اب کیا ہو سکتا تھا مستقیم خاموش ہو رہا۔

قریب قریب دو برس گزر گئے۔ ایک دن گھر سے نکل کر مستقیم ایسے ہی تفریحاً فٹ پاتھ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس نے قصائیوں کی بلڈنگ کی گراؤنڈ فلور کی کھولی کے باہر تھڑے پر محمودہ کی آنکھوں کی جھلک دیکھی، مستقیم دو قدم

سے نکل گیا تھا۔ فوراً مڑ کر اس نے غور سے دیکھا۔ محمودہ ہی تھی۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں۔ وہ ایک بیہودہ دن کے ساتھ جو اس کھولی میں رہتی تھی۔ باتیں کرنے میں مصروف تھی

اس عورت کو سارا ماہم جانتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا کام عیاش مردوں کے لئے جوان لڑکیاں مہیا کرتا تھا۔ اس کی اپنی دو جوان لڑکیاں تھیں۔ جن سے وہ پیشہ کراتی تھی۔ مستقیم نے جب محمودہ کا چہرہ نہایت ہی بیہودہ طور پر میک اپ کیا ہوا دیکھا تو وہ لرز اٹھا۔ زیادہ دیر تک یہ اندوہناک منظر دیکھنے کی تاب اس میں نہیں تھی۔

" وہاں سے فوراً چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے کلثوم سے اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔ کیوں کہ اس کی اب ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ محمودہ اب مکمل عصمت فروش عورت بن چکی تھی۔ مستقیم کے سامنے جب بھی اس کا بیہودہ اور فحش طور پر میک اپ کیا ہوا چہرہ آتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اس کا ضمیر اس سے کہتا "مستقیم جو کچھ تم نے دیکھا ہے۔ اس کے باعث تم ہو۔ کیا ہوا تھا اگر تم اپنی بیوی کی چند روزہ ناراضی اور خفگی برداشت کر لیتے۔ زیادہ سے زیادہ غصہ میں آکر اپنے میکے چلی جاتی۔ مگر محمودہ کی زندگی اس گندگی سے تو بچ جاتی۔ جس میں وہ اس وقت دھنسی ہوئی ہے۔ کیا تمھاری نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اگر تم سچائی پر ہوتے اور سچائی پر رہتے تو کلثوم ایک نہ ایک دن اپنے آپ ٹھیک ہو جاتی، تم نے بڑا ظلم کیا ـــ بہت بڑا ظلم کیا!"

مستقیم اب کیا کر سکتا تھا! کچھ بھی نہیں۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چڑیاں سارا کھیت چگ گئی تھیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرتے ہوئے مریض کو دم آخر میں

آکسیجن سنگھانا تھا

تھوڑے دن کے بعد بمبئی کی حالت فرقہ وارانہ فسادات کے باعث بڑی خطرناک ہو گئی۔ بٹوارے کے باعث ملک کے طول و عرض میں تباہی اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے۔ کلثوم نے مستقیم کو مجبور کیا وہ بھی بمبئی چھوڑ دے۔

چنانچہ پہلا جہاز ملا۔ اس کی سیٹیں بک کرا کے میاں بیوی کراچی پہنچ گئے اور چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔

ڈھائی برس کے بعد یہ کاروبار ترقی کر گیا، اس لئے مستقیم نے ملازمت کا خیال ترک کر دیا۔ ایک روز شام کو دکان سے اٹھ کر وہ ٹہلتا ٹہلتا صدر جا نکلا جی چاہا کہ ایک پان کھائے۔ پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر اسے ایک دکان نظر آئی۔ جس پر کافی بھیڑ تھی۔ آگے بڑھ کر وہ دکان کے پاس پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ محمودہ بیٹھی پان لگا رہی ہے جلے ہوئے چہرے پر اسی قسم کا فحش میک اپ ہے لوگ اس سے گندے گندے مذاق کر رہے ہیں اور وہ ہنس رہی ہے۔ مستقیم کے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ قریب تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے کہ محمودہ نے اسے پکارا ادھر آؤ دولہا میاں۔ تمہیں ایک فرسٹ کلاس پان کھلائیں۔ ہم تمہاری شادی میں شریک تھے۔

مستقیم بالکل پتھرا گیا۔

ختم شد